طارق کی نذر

عرش ملسیانی

یکم مارچ ۱۹۵۱ء

عرش ملسیانی

پبلشر :- مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر)

پرنٹر :- دیال پرنٹنگ پریس فوارہ دہلی

ملنے کا پتہ :-

ہندوستان میں :- رہنمائے تعلیم بک ڈپو مفتی والان دہلی

پاکستان میں :- شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی دفتر رہنمائے تعلیم رام گلی ۳ لاہور

باراوّل	۱۹۵۱ عیسوی	ایک ہزار

قیمت تین روپے

قوسِ قزح

پہلا رنگ ——— خونِ آدم

دوسرا رنگ ——— نوائے عشق

تیسرا رنگ ——— واردات

چوتھا رنگ —— سوز و گداز

پانچواں رنگ —— متفرقات

چھٹا رنگ —— خرابات

ساتواں رنگ —— گیت

تعارف

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ؔ

"لائق باپ کا لائق بیٹا" یہ بہت ہی شاذ سننے میں آتا ہے۔ مجھے یہ محسوس کرکے بہت خوشی ہوتی ہے کہ حضرت جوش ملسیانی کے فرزند عرش صاحب لائق باپ کے لائق بیٹے کہے جانے کے بہرصورت ہی نہیں، یہ احسن الوجوہ مستحق ہیں

حضرت جوش ملسیانی پنجابی ہیں اور یہی نہیں، پنجاب کے ایک گاؤں نکودر، میں اُنھوں نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصّہ گزارا اور آج بھی وہیں مقیم ہیں۔ آپ نہ کبھی دہلی میں رہے، نہ لکھنؤ میں، لیکن زبان کے دونوں مرکزوں اور اہلِ زبان کی صحبتوں سے کوسوں دُور رہنے کے باوجود آپ کی زبان اس قدر پاکیزہ و رواں اور آپ کی فنّی معلومات اس قدر اُستوار و پختہ ہے کہ آپ کو نہایت آسانی کے ساتھ اساتذۂ اہلِ زبان کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

یہی حال عرش صاحب کا ہے۔ پہلے نہروں کے محکمے میں بہتے پھرے۔ پھر پنجاب کے مدارس میں ایک زمانے تک مدّرسی کرتے رہے اور اس کے بعد سرکاری دفاتر کی فائیلوں کے مدّتِ دراز تک مرکب بنے رہے، لیکن ان تمام غیر شاعرانہ جادوں پہ گام زن

رہنے کے باوجود ذوقِ سخن سے کبھی غافل نہیں رہے۔

دارورسن کی زد پہ بھی دم ٹوٹتا نہیں

حبلِ متینِ زلفِ رسا چھوٹتا نہیں

اور "یہ حبلِ متین" چھوٹتا بھی توکیوں کر، قدرت نے عرش صاحب کو اس فرش پر بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ گیسوئے ذوقِ سخن میں گرفتار رہیں اور ع کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند" کا آوازہ بلند کریں۔

عرش صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں، فن کی پابندی کا سختی کے ساتھ لحاظ کرتے اور معائبِ شعری سے دُور رہتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں رُوح اور بیان میں حرارت پائی جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی اکثر نظموں میں مغز اور تفکّر کے نمایاں آثار ملتے ہیں۔

اس دَور میں جب کہ زبان و بیان اور فنّی پابندیوں سے شعراء آزادو بیگانہ ہو چکے ہیں اپنی کمزوریوں اور اپنے عجز پر جدّت طرازیوں کے پردے ڈال رہے ہیں، عرش صاحب کا ان اُمور پر استقلال و اصرار اور ان پابندیوں میں رہتے ہوئے اُن کی خوش گفتاری و شیریں نوائی ہزارہا تحسین و آفریں کے شایاں ہے۔

مجھے اُمیّد ہے کہ عرش صاحب کا مجموعہ خصوصیت کے ساتھ اُن سخن سنج عالمانِ علم و ادب کے واسطے ایک غیر مترقبہ چشمۂ شیریں ثابت ہوگا جن کے کام و دہن کو آزاد قسم کے شعراء کی آزاد نوائیوں سے تلخی و ترشی محسوس ہو رہی ہے۔ اور وُہ فرطِ مسرّت

سے کہہ اُٹھیں گے کہ :-

پس از مدّت گزر اُفتاد بر ما کار دانے را

دہلی ۶ ۱۲/۵ جوش

علّامہ پنڈت برج موہن دتّاتریہ کیفی

آجکل معاشرت کے ہر شعبے میں قدریں کچھ سے کچھ ہو رہی ہیں۔ معیار بدل رہے ہیں۔ نئے نئے پیمانے نکل رہے ہیں۔ ادب میں بھی یہی گھما گھمی مچی ہوئی ہے۔ پرانے معیاروں کو ناقص بتایا جاتا ہے۔ نئے ابھی اپنی صحت ثابت نہیں کر پائے۔ اور تو اور انسان کا نفس اور شعور ہی ایک زیر بحث امر ہے۔ ان صورتوں میں کسی شاعر کے کلام کا تعارف کرانا ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس کا کیا جواب کہ جس شاعر کے کلام کا تعارف مجھے منظور ہے وہ پُرانے اور نئے دونوں قسم کے خیالات کے لوگوں میں ہر دل عزیز ہے۔ یہ ہیں پنڈت بال مکند بی اے عرش ملسیانی۔

ایک اچھے شاعر یا اُستاد کا بیٹا بھی اچھا شاعر ہو یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے ادبی دنیا کے قانون وراثت کے مستثنیات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ مگر میرے دوست حضرت جوش ملسیانی شاگرد رشید حضرت داغ کو بہت خوش قسمت سمجھنا چاہیئے کہ انھیں قدرت نے عرش جیسا فرزند عطا کیا۔ فارسی کی کہاوت ہے ع گر وارث پدر نخواہی علم پدر آموز۔ عرش کو اپنے والد ماجد کی ادبی میراث کا پورا حق ہے کیونکہ اُنھوں نے "علم پدر" پر عبور حاصل کر لیا ہے۔

عرش صاحب اس وقت بیالیس سال کے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر عزیز کے ان بیالیس

سالوں کا صرف نہایت ہوش مندی سے کیا ۔ ان کے شعور کی صحت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اُنھوں نے اپنے طبعی رجحان کا صحیح اندازہ کیا اور جبلّت کے تقاضوں کی مزاحمت نہ کی ۔ جبھی تو اوورسیری سے زندگی شروع کرکے عرش اس وقت ادب اور شاعری کی دنیا کے ایک درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے ۔

رواج تھا کہ زندہ اور جوان شاعر کے کلام پر تبصرہ نہیں کیا کرتے تھے ۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ آگے چل کر اور پختگی کو پہنچ کر نہ معلوم شاعر کی طبیعت کیا رنگ اختیار کرے گویا وہ آم کو ڈالی ہی پر پکنے کا موقع دینا مناسب خیال کرتے تھے ۔ لیکن عرش صاحب کا کلام تو خاصا پختہ ہو چلا ہے اور پھر جیسا کہ آگے کہا گیا ہے پرانی روایات کو آجکل کون مانتا ہے ۔ بہرحال اس تعارف کو تبصرہ یا نقد و نظر نہ سمجھنا چاہئے ۔

عرش صاحب اگرچہ زبردست اور سیر حاصل مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن یہاں صرف ان کی شاعری کا ذکر کیا جائے گا ۔ چونکہ ان کی تعلیم میں مشرقی اور مغربی دونوں ادب داخل تھے ۔ مذاق سلیم اور طبیعت ہمہ گیر تھی ۔ اُنھوں نے دونوں کے محاسن کو اپنے کلام میں سمو دیا ۔ جیسا اثر اور لوچ ان کی غزل میں ہے ویسا ہی زور اور دقّتِ نظر ان کی نظموں میں ہے ۔ گیت بھی خوب لکھتے ہیں ۔ ان میں تأثر اور روانی قابل تعریف ہے ۔ پاکیزہ جذبات کے ساتھ موسیقیت بھی خوب ہے ۔ یہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں فصیح ہوتا ہے ۔ زبان اور محاورے کی دل آویزی، اسلوب کی چُستی، تخیل کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی اور حسن ادا اُن کے کلام کے خاص اوصاف ہیں ۔ ان کے خیالات کا پس منظر خواہ کچھ ہی ہو وہ بیان کی کلاسیکل خوبی اور دلکشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہی امتیاز انھیں اپنے ہم عمر شاعروں سے الگ کرتا ہے ۔

درمدحِ خود می گویم

۲۰ستمبر ۱۹۵۰ء کو عمر کا تینتالیسواں سال شروع ہو گیا۔ اس مدّت میں زندگی نے بہت اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ نصف مدّت تو سرکاری ملازمت کے قفس میں گزری ہے۔ ابھی میعادِ قید ختم نہیں ہوئی۔ جنابِ محرؔوم کا یہ مصرع اس زمانے کی صحیح تصویر ہے۔

بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

کالج کی تعلیم کے زمانے میں گورنمنٹ انجینئرنگ اسکول رسول میں داخل ہُوا، اوورسیر بنا تین بار اس ملازمت کو چھوڑا۔ ذوقِ شعر و ادب کا زندگی پر یہ پہلا نمایاں اثر تھا۔ پھر صنعتی اسکول میں مدّرس ہُوا، اس کے بعد حکومتِ ہند کے دفتروں میں کئی سال گشت کرتا رہا۔ آج کل "آج کل" سے وابستہ ہوں۔ شعر کا ذوق فطری ہے۔ فیضان والدِ محترم کا ہے۔ تتبّع کسی کا نہیں کیا اور نہ کسی سے تلمذ ہے۔ ریڈیو بازی اور مشاعرہ بازی رسوائی کی حد تک کر چکا ہوں اور ابھی تک اس اضطراب کی کسک باقی ہے۔ نثر میں بھی لکھتا رہتا ہوں۔

کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں ہوں، بقول جوش

حرم برگشتہ ہے اور دیر بد ظن
خود اپنا آستاں ہے اور مَیں ہُوں

شعر کہنے کی خاطر شعر کہہ لیتا ہوں۔ وقت کے تقاضوں اور تحریکاتِ حاضر سے رُوگرداں نہیں عام انسان سے ہمدردی میرا مطمحِ نظر ہے۔ لیکن ذہنی عقائد کو عملی صورت دینے سے کسی حد تک قاصر رہا ہوں۔ اسے مصلحت پر محمول فرمائیے یا بزدلی پر —— ضرورت سے زیادہ خودداری اور ذہانت کے باب میں احساسِ برتری کے ہاتھوں اکثر ذلیل بھی ہُوا ہوں لیکن خلوصِ قلب کے سہارے یہ ذلّت خندہ پیشانی سے گوارا کرلی ہے۔ شہرت کے دروازے پہ دریوزہ گری کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پہ دُوسروں کو آمادہ کرنا تو کُجا کبھی ایسے الفاظ سُن کر بھی مسرّت حاصل نہیں کی۔ اپنے کردار پر نقد و تبصرہ کرنے کی اہلّیت نے دوسروں کے نقد و تبصرہ کا کم محتاج رکھا ہے۔ حق بات پہ اَڑنے کی عادت ہے لیکن یہ دعوےٰ نہیں کرسکتا کہ اس راہ پہ پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مصلحت بینی اور توازنِ مزاج کے خزانوں سے حصّہٗ وافر نہیں تو کچھ کم بھی نہیں پایا۔ اس لئے دُنیاوی معاملات میں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی اپنی رائے کو بیشتر کارآمد پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ نثری قصیدہ طویل نہ ہو جائے، اس لئے

اب شعر کے موضوع یا موضوعِ شعر کی طرف آتا ہوں۔

ادب برائے فن یا فن برائے ادب یا رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق دونوں برائے تفنّن کی بحث ایک ذہنی عیّاشی سہی لیکن ہر فن کار کو ایک لائحہ فکر متعین کرنا ضروری ہے۔ اضطراری اور فراری طرزِ عمل سے وہ خود کو اس مبحث سے مامون و مصئون نہیں کر سکتا۔ مَیں نے خود اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اور ایک ایسے واضح نقطۂ نظر پر پہنچا ہوں جہاں یہ دونوں نظریے مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور وہ مقام ہے ادب برائے زندگی کا مقام۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں اُلجھنا اس لئے لاحاصل سمجھتا ہوں کہ یہ بحث ہی بے بنیاد ہے۔ ادب برائے ادب کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اظہارِ مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد سہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثّر ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ زندگی سے کسی ادب کو یا ادیب کو مفر ہی نہیں۔

آج کل ترقّی پسندی اور رجعت پسندی کا عام چرچا ہے۔ بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ خود ترقّی پسندوں کو مہمل گو کا خطاب عطا کرنے والے اس بات کے متمنّی ہیں کہ اُنھیں ترقی پسند کہا جائے۔ روائتی شاعری اور اُس کا میکانکی اندازِ قبولیت کی بارگاہ سے بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہے۔ وہ اسی کا اہل بھی تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال تاریخِ عالم میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تہذیب

کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں ہوں، بقول جوش

حرم برگشتہ ہے اور دیر بدظن
خود اپنا آستاں ہے اور مَیں ہُوں

شعر کہنے کی خاطر شعر کہہ لیتا ہوں۔ وقت کے تقاضوں اور تحریکاتِ حاضرہ سے رُوگرداں نہیں عام انسان سے ہمدردی میرا مطمحِ نظر ہے۔ لیکن ذہنی عقائد کو عملی صورت دینے سے کسی حد تک قاصر رہا ہوں۔ اسے مصلحت پر محمول فرمائیے یا بزدلی پر ـــــ ضرورت سے زیادہ خودداری اور ذہانت کے باب میں احساسِ برتری کے ہاتھوں اکثر ذلیل بھی ہُوا ہوں لیکن خلوصِ قلب کے سہارے یہ ذلّت خندہ پیشانی سے گوارا کر لی ہے۔ شہرت کے دروازے پر دریوزہ گری کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پر دُوسروں کو آمادہ کرنا تو کُجا کبھی ایسے الفاظ سُن کر بھی مسرّت حاصل نہیں کی۔ اپنے کردار پر نقد و تبصرہ کرنے کی اہلیت نے دوسروں کے نقد و تبصرہ کا کم محتاج رکھا ہے۔ حق بات پر اَڑنے کی عادت ہے لیکن یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اس راہ پر پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مصلحت بینی اور توازن مزاج کے خزانوں سے حصّۂ وافر نہیں تو کچھ کم بھی نہیں پایا۔ اس لئے دُنیاوی معاملات میں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی اپنی رائے کو بیشتر کار آمد پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ نثری قصیدہ طویل نہ ہو جائے، اس لئے

اب شعر کے موضوع یا موضوعِ شعر کی طرف آتا ہوں۔

ادب برائے فن یا فن برائے ادب یا رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق دونوں برائے تفنّن کی بحث ایک ذہنی عیّاشی سہی لیکن ہر فن کار کو ایک لائحہ فکر متعین کرنا ضروری ہے۔ اضطراری اور فراری طرزِ عمل سے وہ خود کو اس مبحث سے مامون و مصئون نہیں کر سکتا۔ مَیں نے خود اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اور ایک ایسے واضح نقطۂ نظر پر پہنچا ہوں جہاں یہ دونوں نظریے مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور وہ مقام ہے ادب برائے زندگی کا مقام۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں اُلجھنا اس لئے لاحاصل سمجھتا ہوں کہ یہ بحث ہی بے بنیاد ہے۔ ادب برائے ادب کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اظہارِ مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد سہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ زندگی سے کسی ادب کو یا ادیب کو مفر ہی نہیں۔

آج کل ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا عام چرچا ہے۔ بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ خود ترقّی پسندوں کو مہمل گو کا خطاب عطا کرنے والے اس بات کے متمنّی ہیں کہ اُنھیں ترقی پسند کہا جائے۔ روائتی شاعری اور اُس کا میکانکی انداز قبولیت کی بارگاہ سے بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہے۔ وہ اسی کا اہل بھی تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال تاریخِ عالم میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تہذیب

اور علم کی قدریں اس سے پہلے کبھی اس تیزی سے تبدیل نہیں ہوئیں جتنی اس مدت میں۔ جس ادیب اور فن کار نے اس تیز رفتار تبدیلی کا ساتھ نہیں دیا وہ پیچھے رہ گیا۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ خود اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ عقائد اور نظریوں کے اس طوفان میں کتنے ادیب ہیں کہ بے محابا بہ گئے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ اپنے مزاج اور تفکر کا توازن بھی قائم رکھ سکے ہیں یا نہیں۔ غرض ایک انتشار کا عالم ہے۔ صراحت سے کہوں تو کہنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو نظامِ عالم میں ایک ایسی خوش آیند تبدیلی چاہتے ہیں جس سے غریب اور مزدور کو صرف پیٹ بھر کر روٹی ہی نصیب نہ ہو بلکہ قدرت کی فیاضیوں سے وہ اتنا ہی فیض یاب ہو سکے جتنا کوئی اور شخص، یہ فتوے بھی صادر کر چکے ہیں کہ مارکسی نظامِ معاشرت پر یقین نہ رکھنے والا اس دور میں ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک تو خیر قباحت نہیں اس سے بھی ایک قدم آگے وہ قولِ فیصل ہے کہ وہ فن کار جو اپنے قول و عمل سے سارے عالم کے نظامِ معاشرت پر مارکس کی مہر ثبت کرنے میں معاون نہیں ہوتا رجعت پسند ہی نہیں بلکہ مردود ہے، گردن زدنی ہے۔

ان تمام مسائل سے قطع نظر میں نے عظمتِ اولادِ آدم اور انسان کی عام محبت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے۔ مذہب کی چیرہ دستیوں اور امن کش فساد انگیزیوں اور جنگ آفرینیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پچھلے پچیس سال میں دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں۔ سیاست و

معاشرت کے باب میں بہت سے پُرانے بُت ٹوٹ گئے۔ انقلاب و بغاوت کی چنگاریاں
ایک بھیانک آگ بن گئیں جس نے قدامت کے فرسودہ نظام کو جلاکر خاک سیاہ کر دیا۔
آج سے قریب قریب پچیس سال پہلے میں نے سو فیصدی روائتی شاعری سے شعر گوئی
شروع کی اور اب ایسے مقام پر پہنچا ہوں کہ گو روایت کا اسیر نہیں لیکن میری تخلیقات
میں روایت کے عناصر مفقود بھی نہیں۔ اتنی سُوجھ بُوجھ ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اسی
نیم روائتی ڈگر پر استقلال سے چلتا رہا تو شاید یہ استقلال، انتقالِ مرگ بن جائے گا۔
میری بہت سی حال کی نظمیں اس احساس کی آئینہ دار ہیں۔ اُن میں سے بہت کم اس
مجموعے میں شامل ہو سکی ہیں۔ لیکن اُن سے اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ دل و دماغ پر
تبدیلی کا ایک جنون مسلّط ہے۔

مجھے وہ شاعری پسند نہیں جس میں مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی تلقین یا لوٹ کھسوٹ
اور غارت گری کے نعرے ہوں۔ اظہارِ مطالب کے باب میں عجزِ طبیعت کو غلط زبان
اور غلط ترکیبوں کی "جدّت آفرینیوں" سے چھپانا میرے نزدیک مستحسن نہیں۔ وہ شاعری جو شعریت
سے خالی ہے جس میں رس اور لوچ نہیں جو موسیقی اور مصوّری سے مبرّا ہے۔ تضیعِ
اوقات کے سوا کچھ نہیں۔

اس مجموعے میں کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ اُن میں زیادہ تر دیہی زبان استعمال کی

ہے جو گیت کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ شمالی ہندوستان کے عام دیہاتی گیت میٹھی اور پیاری ہندوستانی زبان میں ہیں اس لئے فارسیت زدہ اُردو کے شیدائیوں سے مَیں اس باب میں معذرت چاہوں گا۔

لااُبالی قسم کی بے راہ روی کا مَیں قائل نہیں۔ محض ترقّی پسند کہلوانے کی خاطر ہر پُرانی چیز پر لعنت بھیجنے کے لئے طیّار نہیں۔ اپنی کم مائگی کا احساس ہر وقت رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے شعر کی جنسِ کاسد کو مغتنم سمجھتا ہوں۔ کیونکہ حاجی اور مُلّا گوئی قسم کے پراپیگنڈے کا ملمّع اسے نظر فریب تابنا کی عطا نہیں کر رہا۔

ہفت رنگ اسم بامسمیٰ ہے۔ اس میں سات رنگ ہیں۔ مجھے مسرّت ہے کہ پڑھنے والوں نے تغزّل کو اس میں نمایاں دیکھا ہے۔ میں نے قریب قریب ہر صنفِ سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن یہی رنگ میرا محبوب رنگ ہے۔ ردیف اور قافئے کی خوش آہنگی سے کان اب اس قدر آشنا ہو گئے ہیں کہ نظمِ آزاد میں مجھے وہ دلآویزی نظر نہیں آتی جو پابند نظم کا حصّہ ہے۔ پھر بھی بہت سی آزاد نظموں کے مطالعے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ اظہارِ مطالب اور تسلسل بیان کے لئے یہ صنف بہت موزوں ہے اور اس کا مستقبل بہت اُمیّد افزا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں جوش ہے، ولولہ ہے، انھوں نے ایسے ماضی کو کم دیکھا

ہے جو فرسودہ اور قدامت پرست تھا۔ اس لئے انھیں ان لوگوں پر انگشت نمائی نہیں کرنی چاہیئے جن کے کلام سے روایت و قدامت ابھی مٹ نہیں گئی۔

اس امید پر ہفت رنگ کو قدر شناسوں کے سپرد کرتا ہوں کہ اس کا ایک شعر بھی اگر انھیں پسند آئے گا تو میری کوشش مشکور ہو جائے گی ؎

چو بیتے پسند آیدت از ہزار
بمردی کہ دست از تعنّت بدار

عرش ملسیانی
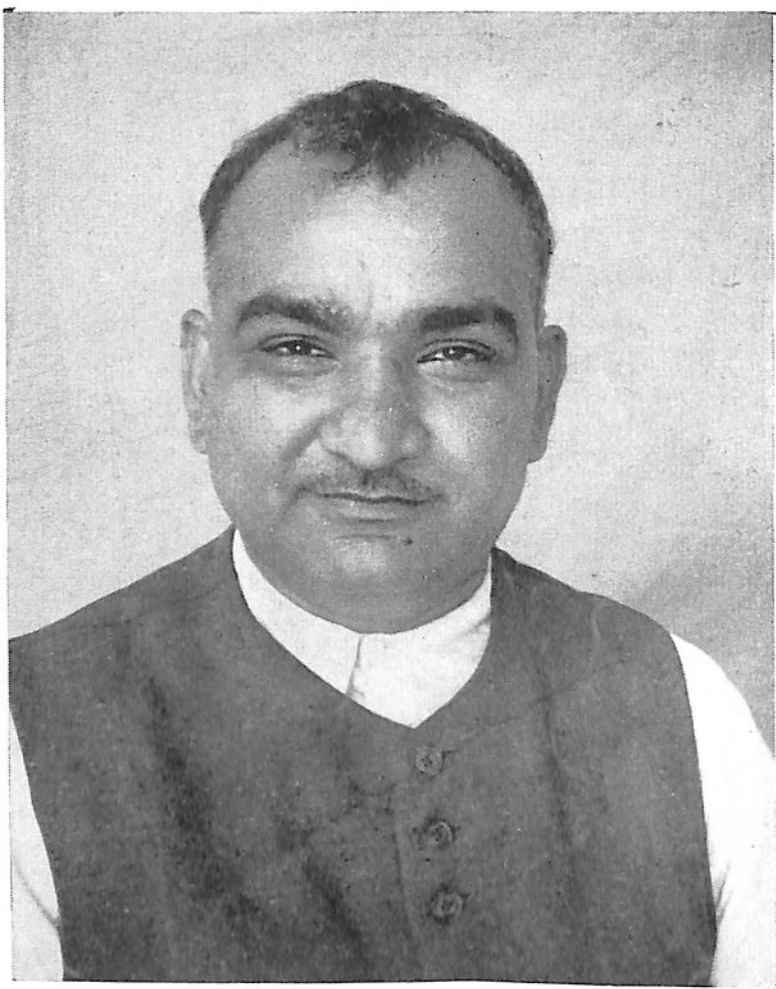
شعر و شرع و عرش از هم ساختند
این در عالم از سه حرف آراستند
عطار

جہانے تیرہ تر از آفتابے

صوابے او سراپا ناصوابے

ندانم تا کجا ویرانۂ را

دہی از خونِ آدم رنگ و آبے

(اقبال)

جہل کی رات

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی
ذہنِ انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی

پائے عالم میں ہے زنجیرِ قدامت اب تک
گردنِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی

طاقتِ جستِ عمل سے ہیں ابھی دل محروم
زینۂ عقدہ کشائی ہے مناجات ابھی

دل میں انسان کے ہے وحشتِ اِشراق ہنوز

ثبت اُذہان پہ ہے مُہرِ کرامات ابھی

رُوحِ احساس پہ ہے گردِ تنک مایہ ہنوز

دوشِ افکار پہ ہے زُلفِ خرافات ابھی

جنّتِ "خوب" میں ہے شیخ کا ہر قول ہنوز

دوزخِ "زشت" میں ہے رِند کی ہر بات ابھی

مُنعمِ بیہُدہ ہے مرکزِ انعام اب تک

مفلسِ غمزدہ ہے موردِ آفات ابھی

خونِ مزدور ہے ارزاں ابھی پانی کی طرح

بہرِ سرمایہ ہے یہ مُفت کی سوغات ابھی

عیب سازوں سے ہیں افسردہ ہنرمند اب تک
نقص بازوں سے ہیں آزردہ کمالات ابھی

دہر میں جوہرِ قابل کی نہیں قدر کہیں
پُجتے ہیں جاہ و حشم کے ہُبَل ولات ابھی

رہروِ راہِ تعقُّل کا خُدا حافظ ہے
راہ میں وہم کے لاکھوں ہیں مقامات ابھی

خاکۂ حُسن ابھی ذہنِ تصوّر میں نہیں
خام تخئیل ہے محرومِ محاکات ابھی

ابھی آئینۂ افکار نہیں پیشِ نظر
دل ہے نظّارگیٔ جلوۂ آیات ابھی

ابھی ممنوع ہے دارائیٔ شرح وتفسیر
نازفرما ہیں اشارات وکنایات ابھی
خندۂ دلکش وگلدستۂ رنگیں کے عوض
خنجر وتیغ سے ہوتی ہے مدارات ابھی
آشیاں امن کا اب تک نہیں مسجودِ بشر
آستاں جنگ کا ہے قبلۂ حاجات ابھی
گرہِ زیست کے ہیں عُقدہ کشا ناخنِ مرگ
خدمتِ امن میں داخل ہیں فسادات ابھی
عرشؔ کیوں خواب سے بیدار ہُوا جاتا ہے
بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

۱۹۴۸

کم ظرف دُنیا

یہ دَورِ خرد ہے دَورِ جنوں اِس دَور میں جینا مشکل ہے

انگور کی مے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے

جب ناخنِ وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رُک نہ سکے

اب چاکِ دلِ انسانیت سیتے ہیں تو سِینا مشکل ہے

جو "دھرم" پہ بیتی دیکھ چکے "ایماں" پہ جو گُزری دیکھ چکے

اس "رام و رحیم" کی دُنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

اِک صبر کے گھونٹ سے مٹ جاتی سب تشنہ لبوں کی تشنہ لبی

کم ظرفیٔ دُنیا کے صدقے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

وُہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے

بجھنے کا سلیقہ آساں ہے جلنے کا قرینا مشکل ہے

کرنے کو رفو کر ہی لیں گے دُنیا والے سب زخم اپنے

جو زخم دلِ انساں پہ لگا اُس زخم کا سینا مشکل ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے

اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

ملنے کو ملے گا یا آخر اے عرش سکونِ ساحل بھی

طوفانِ حوادث سے لیکن بچ جائے سفینا مشکل ہے

۱۹۵۰

غمِ ماحول

چلیں گی دہر میں بربادیوں کی آندھیاں کب تک
چراغِ عظمتِ آدم نہ ہوگا ضو فشاں کب تک

نظامِ برہمِ عالم کا ماتم تا بہ کے ہوگا
رہے گا سرنگوں تنظیمِ انساں کا نشاں کب تک

توہم کو ملے گا نام کب تک عقل و دانش کا
غبارِ راہ پہ ہوگا گمانِ کارواں کب تک

چلے گی بحث کب تک دوزخ و جنّت کے جھگڑوں کی

رہے گی عقلِ انساں مبتلائے این و آں کب تک

وہ انساں جورِ انساں سہہ کے بھی جو اُف نہیں کرتے

نہ سمجھی جائے گی اُن بے زبانوں کی زباں کب تک

فروغِ جاں نہ ہوگی روشنی کب تک بصیرت کی

رہیں گے داغِ دل بن کر جہالت کے نشاں کب تک

ہنسی کب تک اُڑے گی عظمتِ اولادِ آدم کی

رہے گی آدمیّت ایک جنسِ رائگاں کب تک

کبھی تو چھیڑ سازِ دل پہ کوئی پُر اثر نغمہ

غمِ ماحول میں اے عرش یہ آہ و فغاں کب تک

۱۹۴۹

اِنتباہ

سُکھ کی گردن کاٹ رہی ہے دنیا کی تلوار تو دیکھ
جِس تلوار کو چُوم رہا ہے اُس تلوار کی دھار تو دیکھ
جان یہاں ہر چیز کی قیمت آن یہاں ہر چیز کا مول
سَودا کرنے والے غافِل پہلے یہ بازار تو دیکھ

چھوٹ چکیں تہذیب کی نبضیں تجھ کو لیکن ہوش نہیں
فکرِ درماں سے پہلے تو رنگِ رُخِ بیمار تو دیکھ

ڈنک نہایت زہریلے ہیں مذہب اور سیاست کے
ناگوں کی نگری کے باسی ناگوں کی پھنکار تو دیکھ

اس کی زد میں جو بھی آیا خاک ہُوا برباد ہُوا
یہ تہذیب کا فِتنہ اور اس فِتنے کی رفتار تو دیکھ

کِتنے تیر گئے ہیں اِس کو کِتنے اِس میں ڈوب گئے
کھیل نہیں ہے جیون ساگر تو اِس کے اُس پار تو دیکھ

کُند چھُری ہے اور اس سے مظلوم کی گردن کٹتی ہے
عیش کی حسرت تو یہ تو یہ اندازِ آزار تو دیکھ

نازک کشتی نازک چپّو اور اس پر طوفان کا زور
پار کرے گا دریا کو تو اپنی جانِ زار تو دیکھ

عرش کہاں تک آخر یہ پُر لُطف سُہانی اُمیدیں
خوش فہمی پر پھول نہ اِتنا کیسے ہیں آثار تو دیکھ

۱۹۴۳

ہر دِل پہ ہے اِک ہَول سراسر تسلیم
اب قوَل نہیں قوَل سراسر تسلیم

شیطان پہ لاحَول سراسر باطل
انسان پہ لاحَول سراسر تسلیم

۱۹۴۷

"اشرف المخلوق"

اے حالِ پریشانِ جہاں دیکھنے والو

اے نبضِ جوانانِ جہاں دیکھنے والو

دیکھو تو ذرا یہ قفس و دام کی دُنیا

آزار کی دُنیا غم و آلام کی دُنیا

تہذیب پہ تخریب ستم توڑ رہی ہے

ہمت ہے کہ ہر گام پہ جی چھوڑ رہی ہے

یہ ٹینک، یہ بم اور یہ توپوں کے دہانے

بے مہریِ انساں کے سناتے ہیں فسانے

خونخواریِ انساں کی یہ گھاتیں ہیں قیامت

اس اشرفِ مخلوق کی باتیں ہیں قیامت

جو بات ہے اس کی وہ درندوں سے فزوں ہے

یہ جنگ کی خواہش ہے کہ شیطاں کا فسوں ہے

تہذیب کے ضامن بھی ہیں تہذیب کے دشمن

اپنے بھی پرائے ہیں تو رہبر بھی ہیں رہزن

پامال کئے جاتی ہے رفتارِ زمانہ
مظلومئ اقوام کی حد ہے نہ ٹھکانہ
یہ حرب کے آلات یہ سامان فنا کے
یہ فتنۂ قیامت کے یہ طوفان بلا کے
بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار تو دیکھو
فتنے کی ذرا گرمئ بازار تو دیکھو
اے اہلِ وطن اپنے وطن کے ہوا ہیں تم
خادم ہے اگر اس کی محبّت تو نگیں تم
اُٹھو کہ اب ایسے میں تو سونا نہیں اچھا
طوفان میں یوں جی کو ڈبونا نہیں اچھا

آپس کی لڑائی کا گماں تک بھی نہ چھوڑو
اب بغض و عداوت کا نشاں تک بھی نہ چھوڑو
اربابِ غرض کو کبھی ہمدرد نہ سمجھو
کینے کے جو ہیں مرد انہیں مرد نہ سمجھو
۱۹۴۲

تیور تو دیکھ زمانے کے

ہر بات میں آپا دھاپی ہے چالاکی ہے طرّاری ہے

دُنیا کے فسانے کا عنواں مکّاری ہے عیّاری ہے

افسوس کہ ایسی دُنیا میں تو مستِ مئے خودداری ہے

تیور تو دیکھ زمانے کے

راحت کا یہاں اب کام نہیں یہ دَور ہے رنج و مصیبت کا

معصوم کی گردن کٹتی ہے صد چاک ہے دامن عصمت کا

ہے ناز شرافت پر تجھ کو ذلّت ہے مول شرافت کا

تیور تو دیکھ زمانے کے

زہریلے ڈنک چلاتے ہیں دُنیا پر یہ دُنیا والے

گوری قوموں کی چاندی ہے معتوبِ مقدّر ہیں کالے

تو کیوں ہے عمل سے بیگانہ اے کیفِ خودی کے متوالے

تیور تو دیکھ زمانے کے

جو خود منزل سے غافل ہیں ایسے ہیں راہنما لاکھوں

خود عقدہ جن کا حل نہ ہُوا ایسے ہیں عقدہ کشا لاکھوں

لیکن تو عجز کا بندہ ہے جس بندے کے آقا لاکھوں

تیور تو دیکھ زمانے کے

ہر گھر میں ہوس کا ڈیرا ہے ہر دیس میں حرص پرستی ہے،

اقوام کے امن کی خود دشمن اقوام کی غالب دستی ہے

کیفیتِ امن کے شیدائی تو مائلِ کیف و مستی ہے

تیور تو دیکھ زمانے کے

زردار کے پلّے میں شہرت مفلس کا جہاں میں نام نہیں

کثرت ہے خداؤں کی اتنی بندے کا یہاں کچھ کام نہیں

مرنے کی دعا ہر لب پر ہے جینے کا کہیں پیغام نہیں

تیور تو دیکھ زمانے کے

اب وجہِ فساد تجارت ہے اب امن کی ضامن جنگ ہوئی

ناموس پہ مٹنے کی خواہش اس دور میں وجہِ ننگ ہوئی

اللہ کے بندوں پر تو یہ اللہ کی زمیں بھی تنگ ہوئی

تیور تو دیکھ زمانے کے

اب پند و نصائح سنتے ہیں ہم توپوں اور مشینوں سے

ہوتا ہے علاجِ دردِ جہاں تلواروں سے سنگینوں سے

ہے اب تک لیکن ربط تجھے سجدوں سے اور جبینوں سے

تیور تو دیکھ زمانے کے

جڑ کاٹ کے رکھ تقلید کی تُو تیور بھی دیکھ زمانے کے

بنیاد بھی رکھ تجدید کی تُو تیور بھی دیکھ زمانے کے

اُمّید بھی رکھ تائید کی تُو تیور بھی دیکھ زمانے کے

تیور تو دیکھ زمانے کے

درویش کی دُنیا

صد حیف کہ زنجیرئ بیداد جہاں ہے
آزاد روی ہو کہ ہو آزاد نگاہی

چل دہر میں اے مردِ خود آگاہ سنبھل کر
سَو جُرم کا اک جُرم ہے ناکردہ گناہی

دل میں جو نہیں عزم تو کس کام کا وہ دِل
خود تیری تباہی ہے ترے دل کی تباہی

دلِ چیں کا پُرانوار ہے انوارِ خودی سے
ہے اس کے لئے ہیچ مقدّر کی سیاہی
سنتے ہیں غلاموں کا خُدا جاگ اُٹھا ہے
ہے لرزہ بر اندام ہر اک مسندِ شاہی
درویش کی دُنیا ہے مساوات کی دُنیا
عُسرت بھی امارت ہے فقیری بھی ہے شاہی
۱۹۴۰

جب آدمی وحشی بن گیا

بستیوں کی بستیاں برباد و ویراں ہوگئیں

آدمی کی پستیاں آخر نمایاں ہوگئیں

قتل و غارت کے ہزاروں داغ لے کر وحشتیں

آج سُنتے ہیں کہ پھر عصمت بداماں ہوگئیں

دیکھئے سرسبز کب ہوتی ہے کشتِ زندگی

آندھیاں کہتے تو ہیں ابرِ بہاراں ہوگئیں

یوں کبھی مذہب کی قدروں کو نہ انساں چھوڑتا

اے خوشا وہ خود بلائے جانِ انساں ہو گئیں

کون اب نیکی کرے انسانیت کے نام پر

نیکیاں تو جس قدر تھیں صرفِ ایماں ہو گئیں

جن خطاؤں پر درِ جنّت ہُوا آدم پہ بند

وہ خطائیں ہی بنائے بزمِ امکاں ہو گئیں

۱۹۵۰

اِنقلاب

آستانِ دیوِ استبداد پر　　جھک نہیں سکتی جبینِ انقلاب

آسماں کے جَور سے جو تنگ ہوں　　ان کا مامن ہے زمینِ انقلاب

ہے شہیدانِ وطن کی یاد میں　　خون سے تر آستینِ انقلاب

صاحبِ خرمن ہیں دُنیا میں وہی　　جو رہے ہیں خوشہ چینِ انقلاب

جامِ زہرابِ قدامت چھوڑکر　　ہم پئیں گے انگبینِ انقلاب

ہے غلاموں کا خدا عزم بلند　　دین مظلوموں کا دینِ انقلاب

اے قدامت کیش تو بھی تو بدل

ہے اگر تجھ کو یقینِ اِنقلاب

۱۹۴۰

جشنِ آزادی ۱۹۴۸

برق رفتاری پہ اپنی رشک کرتا تھا جہاں
سُوئے آزادی ہمارا قافلہ تھا تیز گام
سیکھنا ہے لیکن اب میخانۂ تعمیر میں
جُنبشِ نبضِ تمنّا و خرامِ دورِ جام

منزلِ مقصود تک وہ قوم جا سکتی نہیں

جس کے قبضے میں نہیں اسپِ سیاست کی لگام

ہم کو بچنا چاہیئے ہر اُس بُرے اقدام سے

جس سے ہو مطعُون دُنیا میں وطن کا نیک نام

اتّحاد و آشتی ہر دم رہیں پیشِ نظر

جاگزیں دل میں رہے ذوقِ عمل بالالتزام

دورِ آزادی کا گو ہر عیش ہے عیشِ حلال

دل یہ کہتا ہے کہ یوں پابند ہونا ہے حرام

دِل کی تلقینات پر پہلے عمل فرمائیے

شوق سے پھر جشنِ آزادی مناتے جائیے

عیش کے ساماں بھی ہوں اور فرض کا احساس بھی

جشن بھی ہو غم زدوں کی ناز برداری بھی ہو

داخلِ آدابِ مے نوشی ہو ساقی کا ادب

مستیاں ہوں مستیوں کے ساتھ ہُشیاری بھی ہو

کچھ ہٹیں اور کچھ بچائیں تشنہ کاموں کے لئے

سادگی کا ناز بھی، اندازِ پُرکاری بھی ہو

حال کی خاطر خرد کوشی ہے مُستحسن مگر

بہرِ مستقبل جنونِ ذوقِ بیداری بھی ہو

نرم رفتاری ہو وقتِ سیرِ گلزارِ طرب

راہِ پُرخارِ عمل میں گرم رفتاری بھی ہو

اس خوشی کے وقت کتنے دل ہیں غم سے پائمال

لطف آ جائے اگر ان سب کی غم خواری بھی ہو

رونے والوں کی ہنسی کو پہلے واپس لائیے

شوق سے پھر جشنِ آزادی مناتے جائیے

با زمانہ مساز

حقیقتاً ہے فریبِ کمال خوش نظری

ترے خیال کے فرضی بُتوں کی عشوہ گری

عجب نہیں کہ خرد کا نقاب اُٹھ جائے

بروئے کار جو آئے جنوں کی پردہ دری

ہزار خونِ دلِ زار سے تو سینچ اسے

مگر یہ شاخِ تمنّا کبھی نہ ہوگی ہری

کبھی خیال بھی آیا ہے اے ہوس کے اسیر

کہ شکوہ سنج ہے تجھ سے دُعا کی بے اثری

حدِ جمال کو ٹھہرا دیا حریمِ جلال

جہانِ ہوش کی اللہ رے یہ بے خبری

پڑے ہیں گوش برآوازہ ہمصفیر ترے

کہاں گیا ترا اندازِ نالۂ سحری

نہیں قصور زمانے کی عیب چینی کا

نظر تری جو نہیں رمزدانِ خودنگری

بیا کہ سازِ جنوں را نوا طراز کنیم

نیاز را بہ دلِ دردمند ناز کنیم

کہاں وہ تاجِ فریدوں کہاں وہ محفلِ کَے

نظامِ برہمِ عالم خسرو کا شاکی ہے

یہ پاشکستگیٔ اضطرابِ انساں دیکھ

کہ آج تک نہ ہُوا مرحلہ سکوں کا طے

مجھے یقین ہے ہو گی قبولِ گوشِ جہاں

جو سازِ دل سے نکل آئے انقلاب کی لَے

کسی خمار زدہ کو سکوں نہیں دیتی

کچھ اَور ہے یہ زمانے کی مے نہیں ہے مے

عجب نہیں ہے کہ دُنیا کی آنکھ کھل جائے

نوا طراز اگر ہو دلِ حزیں کی نَے

کوئی مفسّرِ حاضر تجھے بتا بھی سکا

زمانہ کہتا ہے تہذیب جس کو ہے کیا شئے

یہ وقت ہے کہ زمانے پہ آشکار کریں

وہ رازِ خاص کہ حامل ہیں جس کے یہ رگ و پئے

اماں پذیر نہ ماہی شدہ بہ کامِ نہنگ

سکوں نہ یافت جہاں از فساد و فتنہ و جنگ

چمن کے حق میں خرابی ہے ہستیٔ گلچیں

کبوتروں کے لئے موت پنجۂ شاہیں

بساطِ دہر کی شطرنج ہی نرالی ہے

پیادہ بن نہیں سکتا یہاں کبھی فرزیں

دئے یہ حضرتِ انساں نے زندگی کو فریب

نہ اس کو دولتِ دُنیا ملی نہ دولتِ دیں

غم و الم کی جو پوچھو تو ہر جگہ موجود

مسرّتوں کا کہیں بھی مگر سُراغ نہیں

زوالِ آدمِ خاکی تو دیکھ جُھکتی ہے

حضورِ حضرتِ انساں ہی آدمی کی جبیں

وہ مُنتہائے تجسّس وُہ بارگاہِ سکوں

چل آ کہ ڈھونڈ ہی لیں گے اسے کہیں نہ کہیں

نہیں قضا کوئی آلائشوں سے پاک یہاں

نہ مرگ و زیست کا عالم نہ آسماں نہ زمیں

بیا بہ غیرتِ عزمِ خودت بہ محفلِ ناز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ مساز
۱۹۴۴

دوسری جنگِ عظیم

جنگ کی ہے گرمیٔ بازار کیا ہو گئے حالات کے آثار کیا
کہہ رہا تھا عرش پر روح الامیں ہو گئی مخلوقِ اشرف بھی لعیں
جستجوئے عیش و راحت اک طرف شور و غوغائے ہلاکت اک طرف
تنگ ہے دُنیا غریبوں کے لئے فاقہ مستوں بدنصیبوں کے لئے
ہے دماغِ قومِ انساں میں فتور کیوں اُنہیں "تُو" نے بنایا ذی شعور
۱۹۴۰

رشوت کا بازار

پٹواری کی خود رائی سارے ملک میں چلتی ہے

موٹی توند محصّل کی بالائی سے پلتی ہے

نوٹ مٹھائی کی خاطر ریل کا بابو لیتا ہے

بلٹی لے کر جو آئے فی بوری کچھ دیتا ہے

بھرتی اور کھدائی کے جھوٹے بل بن جاتے ہیں

سونا جان کے مٹّی کو نہر کے بابو کھاتے ہیں

ٹھیکے دینے والوں کی ہر صورت سے چاندی ہے

عزّت پر تو زور نہیں دولت ان کی باندی ہے

پھن پھیلائے پھرتے ہیں پیسے کالے ناگ ہیں یہ

دیش کی پھوٹی قسمت ہیں دیش کے اُلٹے بھاگ ہیں یہ

رشوت خور زمانے میں روگ یہ ایسا پھیلا ہے

اُجلے کپڑے والوں کا اصل میں دامن میلا ہے

بھولے پن سے ہوتی ہیں باتیں ظاہر داری کی

پیسہ ان کا مذہب ہے شان ہے یہ عیّاری کی

خدمت کا تو نام نہ لو فرض کا بھی احساس نہیں

سنکٹ میں ہو دیش تو ہو دیش کا ان کو پاس نہیں

تنخواہوں پر صبر نہیں بھتّوں پر سنتوش نہیں

دکھیاروں کی خاک سُنیں اِن کو اپنا ہوش نہیں

کوٹھی والے صاحب کی خود رائی کا کیا کہنا

اچھّے اچھّے ناموں کی رُسوائی کا کیا کہنا

کم ملتے ہیں ڈھونڈے سے بندے نیک کمائی کے

چرچے یوں تو رہتے ہیں ہر لب پر سچائی کے

لیڈر قسم کے لوگ بھی کچھ رشوت کے متوالے ہیں

جتنے اُجلے کپڑے ہیں اُتنے ہی دل کالے ہیں

رُوکھی سُوکھی چھوڑ کے یہ سونا چاندی کھاتے ہیں
جھوٹ سے ان کے رشتے ہیں بدکاری سے ناتے ہیں

رشوت لینا جُرم سہی رشوت دینا کیا کم ہے
وہ بھی قابلِ نفرت ہے یہ بھی قابلِ ماتم ہے

دھرم کی باتیں رہنے دو حُسنِ عمل کا ذکر کرو
قوم کی عزّت لُٹتی ہے کچھ اس کی بھی فکر کرو

آزادی سے مطلب کیا جھوٹ اور پاپ کا دفتر تھا
یا پھر مجھ سے صاف کہو دَورِ غلامی بہتر تھا

۱۹۴۸

شہیدِ اعظم

زمینِ ہند تھرّائی مچا کہرام عالم میں
کہا جس دم جواہر لال نے "باپو نہیں ہم میں"
فلک کانپا ستاروں کی ضیا میں بھی کمی آئی
زمانہ رو اٹھا دنیا کی آنکھوں میں نمی آئی

کمر ٹوٹی وطن والوں کی اہلِ دل کے دل ٹوٹے

ہوئے افسردہ باغِ نیکی و خوبی کے گُل بُوٹے

ہمیں کیا ہو گیا تھا ہائے یہ کیا ٹھان لی ہم نے

خلوص و آشتی کے دیوتا کی جان لی ہم نے

جو دولت لُٹ چکی افسوس اب واپس نہ آئے گی

ہزاروں سال رو کر بھی اسے دُنیا نہ پائے گی

یہ اچھّی قوم ہے جو قوم کے سردار کو مارے

یہ اچھّا دھرم ہے جو دھرم کے اوتار کو مارے

نگاہِ اہلِ عالم میں ملامت کا ہدف ہم ہیں

ہمیں نے قتل باپو کو کیا ہے ناخلف ہم ہیں

ہمیں ہیں مسلکِ محسن شناسی چھوڑنے والے

کنارے پر پہنچتے ہی سفینہ توڑنے والے

امیدِ قوم کی بنیاد تھی جس ایک بندے پر

غضب ہے گولیاں برسائیں ہم اُس نیک بندے پر

اکیلی جان اس کی بوجھ دنیا بھر کا سہتی تھی

مگر جو بات کہتا تھا وہ آخر ہو کے رہتی تھی

ہزاروں رحمتیں راہِ خدا میں مرنے والے پر

حسینؑ ابنِ علیؑ کی یاد تازہ کرنے والے پر

۱۹۴۸

جیون دان

اُونچے پربت گہرے ساگر دیکھ کے ہیں حیران

اُڑ سکتا ہے کتنا اُونچا

جا سکتا ہے کتنا گہرا

دُھن کا پکّا بات کا سچّا اک کمزور انسان

جسم کا تھا کمزور مگر وہ من کا تھا بلوان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتّم اور مہان

باپو اُتّم اور مہان

طوفانوں میں جس کے بل سے ہر مشکل آسان

سب کو سا ہس دینے والا

دیش کی نیّا کھینے والا

ہاتھ میں لے پتوار اگر وہ کانپ اُٹھیں طوفان

ویر بہادر یودھا جس کا کرے زمانہ مان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتّم اور مہان

باپو اُتّم اور مہان

دیش پِتا نے کٹتی مرتی دیکھی جب سنتان

درد بھری آواز اُٹھائی

گمراہوں کو راہ دکھائی

اس پر بھی جب انت میں دیکھا خود اپنا اپمان

اپنے اک بیٹے کی گولی کھا کر دے دی جان
اس کی اُونچی شان
جگ میں اس کی اُونچی شان
اُتّم اور مہان
باپُو اُتّم اور مہان

دھرتی ڈولی امبر ڈولا دیکھ کے یہ بلیدان
علی، حُسین، حسن کے پتھ پر
عیسےٰ اور لنکن کے پتھ پر
جس پتھ پر سُقراط نے چل کر رکھی اپنی آن

دیا اُسی پتھ پر باپو نے دیش کو جیون دان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتّم اور مہان

باپُو اُتّم اور مہان

۱۹۴۸

خُدا اور اِنسان

خُدا:- وادی و کوہ و دمن مَیں نے تجھے بخشے ہیں

نہر و دریا و چمن مَیں نے تجھے بخشے ہیں

وقف تیرے لئے آسائشِ دُنیا کر دی

گُلِ مقصود سے مَیں نے تری جھولی بھر دی

اِنسان:- تیری دُنیا کو کیا ہے مُتمدّن مَیں نے

جو نہ ممکن تھا بنایا اُسے ممکن مَیں نے

مَیں وہ انساں ہوں تری رحمتِ محکم سے

نسلِ انساں کو مٹا سکتا ہوں ایٹم بم سے

نوائے عشق نہ کرتی اگر حدی خوانی
نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا
(جوش)

محبّت سوز بھی ہے ساز بھی ہے — خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے

نشیمن کے لئے بےتاب طائر — وہاں پابندئ پرواز بھی ہے

مری خاموشئ دِل پر نہ جاؤ — کہ اس میں رُوح کی آواز بھی ہے

خموشی پر بھروسا کرنے والے — خموشی درد کی غمّاز بھی ہے

ہے معراجِ خرد بھی عرشِ اعظم — جنوں کا فرش پا انداز بھی ہے

دلِ بیگانہ خُود دُنیا میں تیرا — کوئی ہمدم کوئی ہمراز بھی ہے

کبھی محتاجِ لَے کا بھی نہیں یہ — کبھی نغمہ رہینِ ساز بھی ہے

کبھی تو دِل ہے محوِ بے نیازی — کبھی طوفِ حریمِ ناز بھی ہے

ترانہ ہائے سازِ زندگی میں — اِک آوازِ شکستِ ساز بھی ہے

عشق کو محوِ ناز ہونے دے
حُسن سے بے نیاز ہونے دے

رکھ نہ درماں سے آسرا کوئی
درد کو چارہ ساز ہونے دے

آہ میں آہی جائے گی تاثیر
آہ کو دل گداز ہونے دے

ترکِ اُلفت کا آ گیا الزام
اب تو افشائے راز ہونے دے

ہے تجھی پر ستم تو پھر اُن کو
خوگرِ امتیاز ہونے دے

حُسن تو ہے ازل سے عشق طراز
عشق کو حُسن ساز ہونے دے

چھپ نہیں سکتے تجھ سے وہ اے عرش
دیدۂ دل تو باز ہونے دے

۱۹۴۰

اب وہ کرتے ہیں مری غم خواریاں　　ہو گئیں آسان سب دشواریاں

عرضِ واجب سے بھی رکھا بے نیاز　　مجھ کو لے ڈوبیں مری خودداریاں

تم نے یہ کیا اپنے دل میں ٹھان لی　　کیوں ہیں میری اس قدر دلداریاں

ان سے ملتا ہے قناعت کا سبق　　ایک نعمت ہیں مری ناداریاں

کوششِ اظہارِ غم بھی ضبط بھی　　آہ یہ مجبوریاں مختاریاں

عرش کیوں ہنستا ہے تو جھوٹی ہنسی
کس سے سیکھی ہیں یہ دنیاداریاں

۱۹۳۸

درد کا حال آہ سے پوچھو　　دل کی باتیں نگاہ سے پوچھو

عظمتِ رحمتِ خداوندی | آرزوئے گناہ سے پُوچھو

اُن کی پیہم نوازشوں کا اثر | میرے حالِ تباہ سے پُوچھو

وقتِ راحت کا کوئی ہے کہ نہیں | رنجِ شام و پگاہ سے پُوچھو

کیوں ہے دنیا نظر میں تیرہ و تار | میرے بختِ سیاہ سے پُوچھو

ماجرا احتیاطِ اُلفت کا | پرسشِ ہر نگاہ سے پُوچھو

عقل کیوں ہے پناہ کی طالب | وحشتِ بے پناہ سے پُوچھو

دلِ خوددار کی زبوں حالی | ہوسِ عزّ و جاہ سے پُوچھو

پستیٔ ہر بلندیٔ دُنیا | منتہائے نگاہ سے پُوچھو

عرش پر کیوں دماغِ عرشؔ اُڑا

مفت کی واہ واہ سے پُوچھو

۱۹۴۳

دل میں ہر وقت یاس رہتی ہے
اب طبیعت اُداس رہتی ہے

اُن سے ملنے کی گو نہیں صورت
اُن سے ملنے کی آس رہتی ہے

موت سے کچھ نہیں خطرہ مجھ کو
وہ تو ہر وقت پاس رہتی ہے

آبِ حیواں جسے بجھا نہ سکے
زندگی کو وہ پیاس رہتی ہے

دل تو جلووں سے بدحواس ہی تھا
آنکھ بھی بدحواس رہتی ہے

ان کی صورت عجب ہے شعبدہ باز
دُور رہ کر بھی پاس رہتی ہے

دل کہاں عرش اب تو پہلو میں
ایک تصویر یاس رہتی ہے

۱۹۳۹

حور پر شیخ مست ہے شاید — کچھ توہّم پرست ہے شاید

دل کا منزل پہ جا کے رُک جانا — اعترافِ شکست ہے شاید

سجدۂ کفر سے نہیں ڈرتا — دل حقیقت پرست ہے شاید

مل ہی جاتا دُعا کو بابِ قبول — ہمّتِ دل ہی پست ہے شاید

میکدے پر یہ کس نے دستک دی — زاہدِ حق پرست ہے شاید

ہے قناعت جو ایک جلوے پر — شوق ابھی تنگدست ہے شاید

اپنے ماضی کو حال سمجھا ہوں — بُود ہمرنگِ ہست ہے شاید

عرش سُنتا نہیں کسی کی بات

حال میں اپنے مست ہے شاید

۱۹۴۲

خوفِ پیری غمِ شباب نہیں — دل کی دُنیا میں انقلاب نہیں

دیکھ لی مہر و ماہ کی تنویر — تیرے رُخ کا کوئی جواب نہیں

اس کی تعبیر پُوچھنے والے — زندگی زندگی ہے خواب نہیں

اس سے بڑھ کر عتاب کیا ہوگا — اب مرے حال پر عتاب نہیں

حُسن کی خود نمائیاں توبہ — بے نقابی پہ بے نقاب نہیں

جَور سمجھوں اسے کہ شانِ کرم — اب انہیں مجھ سے اجتناب نہیں

اللہ اللہ یہ جلوہ آرائی — اب انہیں فرصتِ حجاب نہیں

اس کی دُنیا ہے سربسر جلوہ — حُسن بھی عشق کا جواب نہیں

فطرتِ حُسن ہے حجاب پسند — حُسنِ فطرت تو بے حجاب نہیں

حُسن ہرگز نہیں سرور کا نام — حُسن مستی نہیں شباب نہیں

حُسن ہے قید و بند سے آزاد

رُوحِ معنیٰ ہے یہ کتاب نہیں

۱۹۴۰

خانۂ دل میں داغ جل نہ سکا — اس میں کوئی چراغ جل نہ سکا

نہ ہوئے وُہ شریکِ سوزِ نہاں — دل سے دل کا چراغ جل نہ سکا

سوزِ اُلفت سے عقل ہے محفوظ — جل گیا دِل دِماغ جل نہ سکا

برق تھا اضطرابِ دل لیکن — آرزوؤں کا باغ جل نہ سکا

دلِ مایوس میں اُمید کہاں — بُجھ کے پھر یہ چراغ جل نہ سکا

سرد مہری بھی ان کی رحمت تھی — سینۂ داغ داغ جل نہ سکا

روشنیٔ شعور بھی آئی ، پھر بھی دل کا چراغ جل نہ سکا

عرش کیا تجھ سے فیض محفل کو

تو مثالِ چراغ جل نہ سکا

۱۹۴۲

دیکھ ساون کی یہ ہوا ساقی ، ابر آیا ہے تو بھی آ ساقی

مے کا پینا خطا سہی لیکن ، مے پلانا نہیں خطا ساقی

داد دے ظرفِ مے کشی کی مجھے ، خوب جی کھول کر پلا ساقی

تیری آنکھیں ہی کچھ کریں تو کریں ، میری قسمت کا فیصلا ساقی

آہ تیرا تغافلِ جاں سوز ، آہ برسات کی ہوا ساقی

مَیں ترے دل کو آزماؤں گا ، تو مرا ظرف آزما ساقی

وعظ سننے کو ہم نہیں آئے — کیا سزا اور کیا جزا ساقی

پینے والے خدا کے بندے ہیں — اور تُو بھی ہے باخدا ساقی

ہاں رہے تیرا میکدہ آباد

ہے فقیروں کی یہ دُعا ساقی

۱۹۴۰

محبّت میں کیا کیا جفا کاریاں ہیں — وفاداریاں بھی گنہگاریاں ہیں

مرے شوقِ اُلفت کا انعام دیکھو — وفاؤں کے بدلے جفا کاریاں ہیں

ہر اک دل مرقّع ہے مجبوریوں کا — کچھ ایسی محبّت کی مختاریاں ہیں

محبّت میں مرنا نہیں کوئی مشکل — وہ جینے میں ہیں جتنی دشواریاں ہیں

نرالی ہیں کیفیتیں اپنے دل کی — نہ بے ہوشیاں ہیں نہ ہشیاریاں ہیں

کرامت ہے یہ یا تلوّن ہے ان کا
تغافل میں نہاں خبرداریاں ہیں

لگائی ہے کیا آگ دل میں کسی نے
ہر اک سانس کے ساتھ چنگاریاں ہیں

۱۹۳۷

یہ تلخ و شیریں یہ نیک و بد کیا
اے وحشتِ دل شعورِ خرد کیا

اے عمرِ فانی اے عمرِ فانی
ذکرِ ازل کیا فکرِ ابد کیا

اے پاشکستہ اس جستجو سے
تو ڈھونڈ لے گا دنیا کی حد کیا

کمزور راہی دشوار منزل
احساس پر یہ بارِ خرد کیا

نظمِ جہاں کی اس برہمی سے
ہستی کا دعوےٰ ہے مسترد کیا

جو تو نے بویا وہ تو ہی کاٹے
تجھ پر پڑی ہے تیری ہی زد کیا

یہ بھی ہے دھوکا وہ بھی ہے باطل　　فکرِ جنوں کیوں ذکرِ خرد کیا

جبریل نادم حیراں فرشتے　　آخر کریں گے یہ دام و دد کیا

اے عرش ایسی باتوں سے حاصل

اپنوں سے اُلفت غیروں سے کد کیا

۱۹۴۱

خوشا نصیب ملی اب خرد کی حد مجھکو　　زمانہ کہتا ہے بیگانۂ خرد مجھ کو

حریفِ عقدہ کشائی ہے ہر اضافی بحث　　نہیں پسند یہ تفسیرِ نیک و بد مجھ کو

ازل کی بات جو تھی وہ ازل کیساتھ گئی　　رہے گا اب تو ابد تک غمِ ابد مجھ کو

جنوں کی آنکھ پہنچتی ہے ہر افق سے پرے　　حدِ نظر تو نہیں ہے نظر کی حد مجھ کو

جنوں پسند طبیعت سکوں پذیر رہی　　نہ راس آئی کبھی شورشِ خرد مجھ کو

یہ اختلاف ہے اے عرش شانِ خودداری
زمانہ مجھ سے نفور اور اس سے کد مجھ کو

۱۹۴۴

بگڑی ہوئی قسمت کو بدلتے نہیں دیکھا
آجائے جو سر پر اُسے ٹلتے نہیں دیکھا

کیوں لوگ ہوا باندھتے ہیں ہمّت دل کی
ہم نے تو اسے گر کے سنبھلتے نہیں دیکھا

ہم جور بھی سہہ لیں گے مگر ڈر ہے تو یہ ہے
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا

احباب کی یہ شانِ حریفانہ سلامت
دشمن کو بھی یوں زہر اُگلتے نہیں دیکھا

اشکوں میں سلگتی ہوئی اُمید کو دیکھو
پانی سے اگر گھر کوئی جلتے نہیں دیکھا

ہر دم مرے دل ہی کو جلاتی رہیں آہیں
گھر غیر کا لیکن کبھی جلتے نہیں دیکھا

وہ راہ سجھاتے ہیں ہمیں حضرتِ رہبر
جس راہ پہ اُن کو کبھی چلتے نہیں دیکھا

اُلفت میں اگر جان نکل جائے تو سچ ہے — دل سے مگر ارمان نکلتے نہیں دیکھا

کیوں چاہنے والوں سے خفا آپ ہیں اتنے — پروانوں سے یوں شمع کو جلتے نہیں دیکھا

ہر ایک علاجِ دلِ بے تاب ہے بے سُود — اس کو تو کسی طور بہلتے نہیں دیکھا

اے عرش گنہ بھی ہیں ترے داد کے قابل

تجھ کو کفِ افسوس بھی ملتے نہیں دیکھا

۱۹۴۲

نیرنگیٔ بہار و خزاں دیکھتے رہے — حیرت سے ہم طلسمِ جہاں دیکھتے رہے

ہم اُن کے ساتھ سیرِ جناں دیکھتے رہے — کیا جانے دوست ہم کو کہاں دیکھتے رہے

پیشِ نظر جہاں کے رہی رحمتِ خدا — ہم بہ ہمہ حُسنِ بتاں دیکھتے رہے

ہر گل ہماری عقل پہ ہنستا رہا مگر — ہم فصلِ گل میں رنگِ خزاں دیکھتے رہے

عرضِ نیازِ شوق کی اچھی ملی یہ داد
ہنس کر وہ میرے اشکِ رواں دیکھتے رہے

طے کر گیا جنوں مرا اک جست میں انہیں
حیرت سے مجھ کو کون و مکاں دیکھتے رہے

۱۹۴۱

مرا کارواں لٹ چکا ہے کبھی کا
زمانے کو ہے شوق ابھی رہزنی کا

وفورِ خرد کی عنایت کے صدقے
جنوں تیز ہوتا گیا زندگی کا

گرفتارِ تقلیدِ اجداد ہیں کتنے
بشر پر کھلا راز کب بندگی کا

تجسّس کی اللہ رے حسن آفرینی
حجابات پر بھی گماں ہے اسی کا

محبّت تصوّر، تصوّر محبّت
نہ صورت کسی کی نہ جلوا کسی کا

عجب چیز ہے آستانِ محبّت
نہیں جس پہ مقبول سجدا کسی کا

جو دیکھا تو حسرت جو سمجھا تو عبرت
بہت شور تھا عشرتِ زندگی کا

ستم سے بھی وہ ہاتھ اُٹھانے لگے ہیں
نرالا ہے انداز یہ برہمی کا

بد و نیک سب ہیں اضافی گھروندے
مکافات اک وہم ہے آدمی کا

عنایت ہے عرشؔ ان جفا پروروں کی
مجھے ادّعا ہے وفا پروری کا

۱۹۴۳

عشق کو تیری خوشی سمجھا تھا میں
رنج و غم کو بھی یہی سمجھا تھا میں

اک فریبِ آرزو ثابت ہوا
جس کو ذوقِ بندگی سمجھا تھا میں

موت سے بدتر نظر آئی مجھے
زندگی کو زندگی سمجھا تھا میں

اعتبارِ دوستی بے اصل ہے
اصل ہیں کچھ اور ہی سمجھا تھا میں

وہ محبّت اک مصیبت بن گئی جس کو اب تک دل لگی سمجھا تھا مَیں

احتیاط آموزِ دل نکلی یہی دُشمنی کو دُشمنی سمجھا تھا مَیں

التفات اے عرشؔ اُسی کا نام تھا

جس کو اُن کی بے رُخی سمجھا تھا مَیں

۱۹۴۳

عشقِ بُتاں کا لے کے سہارا کبھی کبھی

اپنے خُدا کو ہم نے پکارا کبھی کبھی

آسودہ خاطری ہی نہیں مطمحِ وفا

غم بھی کیا ہے ہم نے گوارا کبھی کبھی

اس انتہائے ترکِ محبّت کے باوجود
ہم نے لیا ہے نام تمہارا کبھی کبھی

طوفاں کا خوف ہے ابھی شاید کرشمہ کار
آتا ہے سامنے جو کنارا کبھی کبھی

بہکے تو میکدے میں نمازوں پہ آ گئے
یوں عاقبت کو ہم نے سنوارا کبھی کبھی

تنہا روی نے رکھّی ہمارے جنوں کی لاج
گو اہلِ کارواں نے پکارا کبھی کبھی

گو عشرتِ الم میں معاون تھی اُن کی یاد
ہم نے لیا مگر یہ سہارا کبھی کبھی

اب کیا کہیں دلِ مُتلوّن مزاج کو
اکثر یہ آپ کا ہے ہمارا کبھی کبھی
دل غرقِ عیش ہو کے ہُوا لاکھ مطمئن
طُوفانِ غم نے پھر بھی اُبھارا کبھی کبھی
پیہم ستم سے عشق کی تسکین ہو نہ جائے
اے دوست التفات خدارا کبھی کبھی
زاہد بھی چوم لیتا ہے پیرِ مغاں کا ہاتھ
پا کر ترے کرم کا اشارا کبھی کبھی
فریادِ غم سے عرش سنبھلتا ہے دل مگر
لیتے ہیں اہلِ دل یہ سہارا کبھی کبھی

۱۹۴۵

پہلو میں دل نہیں غمِ دوراں لئے ہوئے

قطرہ ہے جوشِ گرمیٔ طوفاں لئے ہوئے

التزامِ پردہ داریٔ ارماں لئے ہوئے

کب تک جئے کوئی غمِ پنہاں لئے ہوئے

پہنچے ہیں اس مقام پہ اب اُن کے حیرتی

وہ خود کھڑے ہیں دیدۂ حیراں لئے ہوئے

بیتاب ہر کلی ہے ہر اک پھُول مُضطرب

آجائیے چمن میں بہاراں لئے ہوئے

موقوفِ حُسنِ گل ہی نہیں رونقِ بہار
بیٹھے ہیں ہم بھی چاکِ گریباں لئے ہوئے

صبحِ ازل اُٹھا تھا کوئی گوشۂ نقاب
اب تک ہے آنکھ دید کا ارماں لئے ہوئے

اک درد لے کے آئی ہے دل میں تمہاری یاد
آجاؤ تم بھی درد کا درماں لئے ہوئے

آتا ہے میکدے کی طرف کون دیکھنا
ماتھے پہ داغِ سجدۂ ایماں لئے ہوئے

آئے ہیں ہر قدم پہ وہ جلوے بکھیرتے
ہر اک ادا میں حسن کا طوفاں لئے ہوئے

ہنگامۂ خرد میں پھر اُٹھا جنوں کا جوش
تسکینِ قلب و روح کا ساماں لئے ہوئے
مصروفِ شرحِ غم ہے ہر اک اہلِ انجمن
بیٹھا ہے عرش ہی غمِ پنہاں لئے ہوئے
۱۹۴۴

تیرا کرم نہ ہو تو فغاں میں اثر کہاں
بے التفاتِ خاص غمِ معتبر کہاں
غربت کہاں وطن کے وہ شام وسحر کہاں
وہ لطفِ کوئے دوست وہ دیوار ودر کہاں

وہ اہتمامِ راحتِ قلب وجگر کہاں
پہلی سی وہ تمہاری کرم کی نظر کہاں

بے تابیاں بجا مرے ذوقِ سجود کی
لیکن اس آستانے کے لائق یہ سر کہاں

اُن کا کرم ہُوا تو گئیں غم کی عشرتیں
اے دوست اب وہ لذّتِ آہِ سحر کہاں

ہم کو قفس سے حکمِ رہائی تو مل گیا
اڑنے کے واسطے ہیں مگر بال وپر کہاں

رہبر تو کیا نشاں کسی رہزن کا بھی نہیں
گم گشتگی گئی ہے مجھے چھوڑ کر کہاں

دل بستگی کا کوئی بھی ساماں یہاں نہیں
ویرانۂ جہاں میں بناؤں میں گھر کہاں
دُنیا میں اور اس کا ٹھکانا کہیں نہیں
جائے غمِ فراق مجھے چھوڑ کر کہاں
چشمِ طلب کے واسطے آساں ہے سیرِ عرش
فرصت خیالِ دوست میں اتنی مگر کہاں
۱۹۴۵

جس غم سے دل کو راحت ہو اُس غم کا مداوا کیا معنی
جب فطرت طُوفانی ٹھہری ساحل کی تمنّا کیا معنی

عشرت میں رنج کی آمیزش راحت میں الم کی آلائش

جب دُنیا ایسی دُنیا ہے پھر دُنیا دُنیا کیا معنی

خود شیخ و برہمن مجرم ہیں اک جام سے دونوں پی نہ سکے

ساقی کی بخل پسندی پر ساقی کا شکوا کیا معنی

جلووں کا تو یہ دستور نہیں پردوں سے کبھی باہر آئیں

اے دیدۂ بے توفیق ترا یہ ذوقِ تماشا کیا معنی

اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پر داد نہیں ملتی

اے غیرتِ دل اے عزمِ خودی اس در پہ سجدا کیا معنی

اے صاحبِ نقد و نظر مانا انساں کا نظام نہیں اچھا

اُس کی اصلاح کے پردے میں اللہ سے جھگڑا کیا معنی

ہر لحظہ فزوں ہو جوشِ عمل یہ فرض ہے فرض کی راہ پہ چل
تدبیر کا یہ رونا کیسا تقدیر کا شکوا کیا معنی

میخانے میں تو اے واعظ تلقین کے کچھ اسلوب بدل
اللہ کا بندہ بننے کو جنّت کا سہارا کیا معنی

اظہارِ وفا لازم ہی سہی اے عرشؔ مگر فریادیں کیوں
وہ بات جو سب پر ظاہر ہے اُس بات کا چرچا کیا معنی

۱۹۴۳

محبّت بگاڑے محبّت سنوارے
نہ تم ہم سے جیتے نہ ہم تم سے ہارے

نہ آنے دیا راہ پر رہبروں نے

کئے لاکھ منزل نے ہم کو اشارے

ہم آغوشِ طوفاں تو ہونا ہے اک دِن

سنبھل کر چلیں کیوں کنارے کنارے

انہیں کر گئی پار ہر کشتیٔ نو

بہت زور پر تھے قدامت کے دھارے

یہ انساں کی بےچارگی ہائے توبہ

دعاؤں کے باقی ہیں اب تک سہارے

وُہ ہے بزم دارائیٔ ابنِ آدم

فرشتہ بھی آ کر جہاں دم نہ مارے

غنیمت ہے یہ ماحصل زندگی کا
دلے دلربائے، غمے غمگسارے

نہ مجنون و لیلےٰ نہ فرہاد و شیریں
فسانے ہیں یہ سب ہمارے تمہارے

یہ اک شعبدہ ہے کہ ہے موج دل کی
کسی کو ڈبوئے کسی کو اُبھارے

وہ جانِ چمن ہی نہیں عرش ورنہ
بہت لطف دیتے چمن کے نظارے

۱۹۵۰

یہ کون آیا رہزن کی طرح جو دل کی بستی لوٹ گیا

آرام کا دامن چاک ہوا تسکین کا رشتہ ٹوٹ گیا

کرتا ہے فراہم کیوں ناداں ٹکڑے دل کے آئینے کے

اب جوڑ کے اس کو کیا لے گا جو ٹوٹ گیا وہ ٹوٹ گیا

ہم جس کو دکھا کر دنیا سے کچھ دادِ محبّت پا لیتے

افسوس کہ غم کی چوٹوں سے وہ دل کا چھالا پھوٹ گیا

دامن میں لئے پھرتی تھی جسے محتاط خرد کی نادانی

ان مصلحتوں کی دولت کو عشق ایک نظر میں لوٹ گیا

بیچارگیٔ دل کے صدقے احساسِ غمِ اُلفت بھی نہیں
یہ ایک سہارا تھا اپنا اب یہ بھی سہارا چھوٹ گیا

اے راہنما تو بیٹھ یہیں ہم خود منزل کو جائیں گے
دو چار قدم چل کر ہی ترا دم ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا

اے عرش وفورِ گریہ میں یہ حُسنِ تصوّر کا حاصل
جلووں کو پروتے تھے جس میں وہ تارِ نظر ہی ٹوٹ گیا

۱۹۴۱

ساقی تری صحبت میں کیا عالمِ مستی ہے
جنّت مری نظروں میں اُجڑی ہوئی بستی ہے

کیوں جام کو مینا سے یوں دُور کیا تُو نے
محفل تو ابھی ساقی پینے کو ترستی ہے

میخانۂ ہستی میں یہ جوڑ نہ ٹوٹے گا
مستی ہے تو رندی ہے رندی ہے تو مستی ہے

پھر فصلِ بہاراں میں آباد ہوئے گلشن
میرے دلِ ویراں پر حسرت ہی برستی ہے

کیا اوج دیا مجھ کو اس حُسنِ تخلّص نے
اے عرش مری دُنیا بیگانۂ پستی ہے

۱۹۴۳

یہ سچ ہے ضبط میں جی کو ڈبویا بھی نہیں جاتا

مگر اب تو یہ عالم ہے کہ رویا بھی نہیں جاتا

خوشی آئے تو غم کو بھول جانا ہی مناسب ہے

مگر غم کو مسرّت میں سمویا بھی نہیں جاتا

دلِ خوددار دامانِ وفا پر داغ ہے بے شک

مگر یہ داغ ایسا ہے کہ دھویا بھی نہیں جاتا

تمہارے منتشر جلووں سے کیا تسکین ہو مجھ کو

نظر کے تار میں ان کو پرویا بھی نہیں جاتا

اگر ساحل نہیں ملتا تو یہ کم ہمّتی کیسی
بھنور میں کیا سفینے کو ڈبویا بھی نہیں جاتا

یہ کیا شانِ تقابل ہے کہ تم تو خندہ بر لب ہو
تمہارے چاہنے والوں سے رویا بھی نہیں جاتا

اُسے کھو کر نشاطِ جستجو سے بہرہ ور ہوتے
مگر وہ دِل نشیں اے عرش کھویا بھی نہیں جاتا

۱۹۴۵

اگر تقدیر تیری باعثِ آزار ہو جائے
تجھے لازم ہے اس سے برسرِ پیکار ہو جائے

مری کشتی ہے، مَیں ہوں اور گردابِ محبّت ہے

جو تو ہو ناخدا میرا تو بیڑا پار ہو جائے

کمالِ ضبطِ غم سے یہ گوارا ہی نہیں مجھ کو

کہ حرفِ آرزو شرمندۂ اظہار ہو جائے

ترے خوابِ گراں پر اے دلِ ناداں تعجّب ہے

کہ تو سوتا رہے سارا جہاں بیدار ہو جائے

اُنہیں کیوں کوستا ہے جو تجھے کہتے ہیں کم ہمّت

بُرا کیا ہے حقیقت کا اگر اظہار ہو جائے

تمہیں اے عرش کیوں ہے تیرِ غم سے اتنی بے زاری

یہی بہتر ہے یہ ناوک جگر کے پار ہو جائے

۱۹۳۴

یوں تو کہنے کو بشر بینا بھی ہے دانا بھی ہے

کیا کوئی اس سے بڑا دنیا میں دیوانا بھی ہے

سُر بھی ہے اک تال بھی اک سُم بھی اک گانا بھی ہے

زندگی عنوانِ افسانہ بھی افسانا بھی ہے

تجھ کو اے دل خود تڑپ کر اُن کو تڑپانا بھی ہے

نازسہنا ہی نہیں ہے ناز فرمانا بھی ہے

آرزو کا ماحصل کھونا بھی ہے پانا بھی ہے

یہ تلوّن کیش دِل بستی بھی ویرانا بھی ہے

تو نے سوچا بھی کبھی ہے اے دلِ منزل طراز
ایک منزل قیدِ منزل سے نکل جانا بھی ہے

مطمئن ہے کیوں رہائی پر روایت کے اسیر
پھاند کر دیوارِ زنداں کو اسے ڈھانا بھی ہے

پھر کوئی پُر سوز نعرہ عصرِ حاضر کے نقیب
گرم ہو کر آج اہلِ دل کو گرمانا بھی ہے

معرفت ہم کو نہ رازِ حُسن پُر فن کی ہوئی
گو بہ فیضِ عشق کچھ سمجھا بھی ہے جانا بھی ہے

عقل والے تو اُٹھا سکتے نہیں بارِ جنوں
کیا کوئی اے اہلِ محفل تم میں دیوانا بھی ہے

عشرتِ منزل رسی اے عرشؔ لازم ہی سہی
گرمیِٔ ذوقِ سفر سے دل کو گرمانا بھی ہے

۱۹۴۹

بیاں ہوں بھی تو ہوں آخر کہاں جو دِل کی باتیں ہیں
نہ تنہائی کی باتیں ہیں نہ یہ محفل کی باتیں ہیں

مرتّب کر لیا یوں ہم نے افسانہ محبّت کا
کچھ اُن کے دل کی باتیں ہیں کچھ اپنے دل کی باتیں ہیں

جو اِن میں پھنس گیا پھر راہ پر وُہ آ نہیں سکتا
بڑے چکّر کی باتیں رہبرِ منزل کی باتیں ہیں

تمہارا واعظ رازِ عشق کیا کھولے گا اے واعظ

زباں کی یہ نہیں حضرت یہ چشم و دل کی باتیں ہیں

وہ محفل سے جدا بھی ہو چکے محفل کو گرما کر

مگر محفل میں اب تک گرمیٔ محفل کی باتیں ہیں

زباں سے کچھ کہو صاحب مگر معلوم ہے ہم کو

تمہارے دل کی سب باتیں ہمارے دل کی باتیں ہیں

مجھے درسِ سکوں دیتے ہیں وہ جوشِ تمنّا میں

اِدھر طوفان کی خواہش اُدھر ساحل کی باتیں ہیں

مَیں اپنے حال و ماضی پر بھی کچھ اے عرش رو لیتا

مگر پیشِ نظر اس وقت مستقبل کی باتیں ہیں

۱۹۴۳

احساسِ حُسن بن کے نظر میں سما گئے
گو لاکھ دُور تھے وہ مگر پاس آ گئے

اک روشنی سی دل میں تھی وہ بھی نہیں رہی
وہ کیا گئے چراغِ تمنّا بجھا گئے

دَیر و حرم سے اور تو حاصِل نہ کچھ ہُوا
سجدے غرورِ عشق کی قیمت گھٹا گئے

تنہا روی میں یوں تو مصیبت تھا ہر قدم
ہم اہلِ کارواں سے تو پیچھا چھڑا گئے

کتنا فریب کار ہے احساسِ بندگی
ہم منزلِ خودی سے بہت دُور آ گئے

اُلفت میں فکرِ زیست ندامت کی بات تھی
اچھے رہے جو جان کی بازی لگا گئے

جو حال اُن کا تھا وُہ ہمیں جانتے ہیں عرش
یوں وہ ہماری بات ہنسی میں اُڑا گئے

۱۹۴۵

وفا پر مِٹنے والے جان کی پروا نہیں کرتے
وہ اِس بازار میں سود و زیاں دیکھا نہیں کرتے

جنہیں گُم گشتگی کے فیض سے ہے ہر قدم منزل

جنونِ شوق میں رہبر کی وہ پروا نہیں کرتے

جنہیں خود اعتمادی مائلِ تدبیر رکھتی ہے

وہ ناکامی میں بھی تقدیر کو رویا نہیں کرتے

نہیں جُھکتی نگاہِ شوق پستی کی طرف اپنی

ہم اپنے ذوقِ نظّارہ کو یوں رُسوا نہیں کرتے

ارادے جن کے طوفانی ہیں فطرت جن کی طوفانی

وہ کشتی کو کنارے کی طرف پھیرا نہیں کرتے

خلوصِ عشق میں خود مطلبی کیسی، ریا کیسی

ہم اِن داغوں سے دامانِ وفا میلا نہیں کرتے

جنہیں اعمال پر خفّت گناہوں پر ندامت ہے
کسی کے عیب کا دُنیا میں وہ چرچا نہیں کرتے

جنہیں اے عرش حق نے دی ہے توفیقِ اوالعزمی
وہ گردابِ حوادث میں کبھی ڈوبا نہیں کرتے
۱۹۳۴

دل ہوتا ہے تسکین کے عالم میں حزیں اور
لے چل مجھے اے شوقِ سبک گام کہیں اور
ہاں اور اُٹھا پردے کو اے پردہ نشیں اور
مجھ سا نہیں کوئی ترے جلووں کا امیں اور

جتنی وُہ مرے حال پہ کرتے ہیں جفائیں

آتا ہے مجھے اُن کی محبّت کا یقیں اور

مے خانے کی ہے شان اسی شورِ طلب سے

ہر اَور نہیں پر ہے تقاضا کہ نہیں اور

ہے حاصلِ صد زیست جوانی کا یہ عالم

اے عمرِ گُریزاں مجھے رہنے دے یہیں اور

مُجھ سا جو نہیں اور کوئی چاہنے والا

تجھ سا بھی زمانے میں نہیں کوئی حسیں اور

کافی نہیں مجھ کو یہ نگاہِ غلط انداز

ہاں اور بڑھا حوصلۂ قلبِ حزیں اور

تکرار کا اسے شیخ یہی تو ہے نتیجہ
تم نے جو کہیں اور تو ہم سے بھی سُنیں اور

ہم مرتبۂ عرش کوئی ان میں نہ ہو گا
ہوں گے درِ جاناں کے بہت خاک نشیں اور
۱۹۴۳

یوں بھی فریبِ ذوقِ طلب کھا رہا ہوں مَیں
تیرا نشان پا کے مٹا جا رہا ہوں مَیں

صد گُونہ رشک ہے مجھے اپنے نصیب پر
دُنیا کو کھو رہا ہوں تجھے پا رہا ہوں مَیں

جو وسوسے تھے دل میں وہ اب ہو رہے ہیں دُور
شاید ترے قریب ہُوا جا رہا ہوں مَیں

دُنیا کو رشک ہے مری فکرِ بلند پر
مجھ کو خبر نہیں کہ اُڑا جا رہا ہوں مَیں

لیتا ہوں اپنا نام کبھی نام غیر کا
یوں بات بات میں اُنہیں اُلجھا رہا ہوں مَیں

آئے گا کب یقین تمہیں میری بات کا
مانو بھی اب تمہاری قسم کھا رہا ہوں مَیں

رہ کر اسیر طاقتِ پرواز تھی کہاں
حیرت ہے کن پروں سے اڑا جا رہا ہوں مَیں

حسرت فزا ہے میرے مصائب کی داستاں
دل کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں مَیں
ہر منظرِ بلند بھی اب پست ہو چکا
اے عرش کس فضا میں اُڑا جا رہا ہوں مَیں

۱۹۳۷

کسی نغمے میں ہے وہ اور نہ کسی ساز میں ہے
رس بھری بزم سی لئے جو تری آواز میں ہے
گوشِ مشتاق کی خود ساختہ تفریق ہے یہ
ورنہ جو ساز سے باہر ہے وہی ساز میں ہے

لے نہ ڈوبے کہیں خوش فہمئی ادراک تجھے
ناخدائی تری پوشیدہ اسی راز میں ہے

آپ ہی زندہ کریں مردہ تمنّاؤں کو
قم باذنی کا اثر آپ کی آواز میں ہے

ہم صفیروں کی نواؤں کا اثر ہے شاید
ہر گرفتارِ قفس کوششِ پرواز میں ہے

کیوں کریں غیر سے ہم عرضِ نیازِ اُلفت
جس کے طالب ہیں ابھی جلوہ گہِ ناز میں ہے

عرش تک دیکھئے پہنچے کہ نہ پہنچے کوئی
آہ کے ساتھ دُعا بھی مری پرواز میں ہے

۱۹۳۴

وارِدات

زکوئے یار می آید نسیمِ بادِ نوروزے
ازیں باد ار مدد خواہی چراغِ دل برافروزے
(حافظ)

آمدِ شباب

رُوح کہتی ہے کہ اُٹھ جامِ مُسرّت پی لے

دلولے کہتے ہیں دو روز تو ہنس کر جی لے

آنکھ کہتی ہے ضرورت نہیں اشکِ غم کی

دیکھ وہ آئی گھٹا اور وہ بجلی چمکی

دل یہ کہتا ہے کہ جذبات کو بیدار تو کر

عشق کو حُسن کے رازوں سے خبردار تو کر

اُنگلیاں کہتی ہیں لا ساز طرب خیز کوئی

لب یہ کہتے ہیں کہ دے ساغرِ لبریز کوئی

درد کہتا ہے مجھے پاس نہ آنے دے کبھی

دل پہ کلفت کی گھٹائیں کو نہ چھانے دے کبھی

شوق کہتا ہے دل و جاں پہ مجھے چھانے دے

اپنے گلزارِ محبّت میں بہار آنے دے

رُخ پہ سُرخی تو طبیعت میں روانی آئی

مژدہ اے جوشِ تمنّا کہ جوانی آئی

۱۹۳۰

کلفٹن[1]

(۱ؔ کراچی کی ایک تفریح گاہ جو سمندر کے کنارے واقع ہے)

شام کو کراچی کے مرد و زن یہاں تفریح کے لئے پہنچتے ہیں اور سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہروں میں نہاتے ہیں۔ مارچ ۱۹۴۰ میں یہ منظر دیکھا اس کی یاد دل میں باقی رہی۔ جولائی ۱۹۴۰ میں یہ نظم کہی گئی :-

اک کیف کا عالم تھا سمندر کے کنارے

دیکھے جو کراچی میں کلفٹن کے نظارے

اُٹھتی ہوئی لہروں میں شفق عکس فگن تھی

جیسے کہ ہوں پانی سے ہم آغوش شرارے

نکھری ہوئی وہ شام وہ تزئینِ مناظر

وہ موج میں آئے ہوئے بہتے ہوئے دھارے

گُل پوش حسینوں کا وہ سیلاب کہ توبہ

مہ پاروں کے جمگھٹ وہ سمندر کے کنارے

مُوجوں کے تلاطم میں وہ ڈر ڈر کے سنبھلنا

چلنا وہ حسینوں کا حسینوں کے سہارے

امواج کے پردے میں وہ اِک آنکھ مچولی

لہروں کے حسینوں سے اشاروں پہ اشارے

اک رقص کے عالم میں تھے کمسن بھی مُسن بھی

یا چوکڑی بھرتے تھے ہرن اور چکارے

وُہ چُومنا اُڑ اُڑ کے بدن سیم تنوں کے

پانی کی یہ چھینٹیں تھیں کہ سیماب کے پارے

اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی نوخیز جوانی

میرے دلِ افسردہ پہ چلتے ہوئے آرے

اس کیف کی دُنیا میں بھی بے کیف رہا مَیں

جیتا ہُوا پالا بھی نہ ایسے کوئی ہارے

پھر پردۂ غم چھیڑ گئے بربطِ دل کا

لمحات جو دو چار کلفٹن پہ گزارے

طاری ہُوا ہر سمت فضاؤں پہ دھندلکا

ٹوٹا تو یہ کہتے تھے چمکتے ہوئے تارے

جنّت میں بھی رہتا ہے جو آلودۂ غم تُو

آیا تھا یہاں کس لئے تقدیر کے مارے

دل ہنس دیا اک کافرہ کی یاد میں رو کر

جب وہ نہیں جذبات کو پھر کون اُبھارے

مَیں کیوں بھُول جاؤں

تری چشمِ میگوں کا لبریز ساغر
جوانی تیری کیف آور جوانی

گلستاں در آغوش حُسنِ تبسّم
وہ تیرے لبِ سُرخ کی گل فشانی

تکلّم کے انداز خاموشیوں میں
زبانِ نظر پر حیا کی کہانی

توہی مجھ سے کہہ دے مَیں کیوں بھُول جاؤں!

وہ سانسوں کی تیزی وہ سینے کی دھڑکن
وہ دونوں کا چھپ چھپ کے آنسو بہانا

وہ تجدیدِ اُلفت کے سَو سَو بہانے
وہ اِک دوسرے سے یُونہیں رُوٹھ آنا

وہ ترکِ محبّت کے الزام دے کر گِسی کا کِسی کو ہنسی میں رُلانا

تُو ہی مجھ سے کہہ دے مَیں کیوں بھول جاؤں

وہ پاسِ ادب وہ خلوصِ محبّت وفورِ تمنّا میں خاموش رہنا

وہ نظّارگی میں تحیّر کا عالم خود اپنی نگاہوں سے رو پوش رہنا

رضا جو طبیعت وہ تسلیم کیشی غم و رنج میں بھی وفا کوش رہنا

تُو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

سوالوں کا طُومار مبہم زباں میں مگر رازِ دل کا نہ اظہار کرنا

نگاہیں ملانے میں تو اک جھجک سی مگر دل ہی دل میں مجھے پیار کرنا

وہ عرضِ محبّت پہ معصوم وعدے وہ لُکنت زباں کی وہ اقرار کرنا

تُو ہی مجھ سے کہہ دے مَیں کیوں بھول جاؤں

تری چشمِ پُرنم وہ مسعود ساعت
یقیں بن گیا جب گمانِ محبّت

محبّت کے دن اور وہ فرقت کی راتیں
دُعائیں تھیں جب ترجمانِ محبّت

وُہ خط جن کا ہر لفظ اک داستاں تھا
وہ جذبات سے پُر بیانِ محبّت

تو ہی مجھ سے کہہ دے مَیں کیوں بھُول جاؤں

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی کی بہاریں
وہ گلپوش راتیں وہ دلکش نظارے

مناظر سمٹتے ہوئے آبِ جو میں
فلک پر چمکتے ہوئے چاند تارے

وہ تھک کر کسی کا یونہیں بیٹھ جانا
وہ اُٹھنا کسی کا کسی کے سہارے

تُو ہی مجھ سے کہہ دے مَیں کیوں بھُول جاؤں

وہ طوفانِ جذبات وہ زورِ تمنّا
وہ جوشِ محبّت وہ پُرشوق باتیں

وہ گھڑیاں وہ آرام و راحت کی گھڑیاں
وہ فرصت کے دن وہ مسرت کی راتیں

وہ گھاتیں وہ گھاتوں کے پردے میں وعدے
وہ وعدے وہ وعدوں کے پردے میں گھاتیں

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

مآلِ مسرّت وہ مجبور آنسو
وہ کیفِ طرب کا غم انجام ہونا

پُر الزام باتیں وہ سب کی زباں پر
محبّت کے قصّے کا وہ عام ہونا

وہ برگشتہ خاطر بزرگوں کی باتیں
وہ معصوم رُوحوں کا بدنام ہونا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وُہ ناگاہ فرقت پہ مجبور ہونا
فریبِ مقدّر کی وُہ چیرہ دستی

خمارِ مئے عیش اور نامرادی
وہ مرگِ تمنّا وہ انجامِ مستی

رسومِ کہن کی ستم آفرینی
زمانے کا جورِ قدامت پرستی

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

۱۹۴۰

کل رات سے

کس قدر ہے اُن سے ملنے کی خوشی کل رات سے

زندگی میں آگئی ہے تازگی کل رات سے

وعدۂ فردا پہ مجھ کو آرہا ہے اعتبار

ہو رہی ہے دُور دل کی بے کلی کل رات سے

مَیں فراہم کر رہا ہوں عیش کا سامان اب

ہو چکی ہے ختم غم کی زندگی کل رات سے

دل میں جو شکوے تھے وہ اب ہیں پُرانی داستان
بس گئی ہے دل میں اک دنیا نئی کل رات سے

اک تبسّم کی ادا نے مجھ پہ جادو کر دیا
ہو گئی ہے دُور دل کی برہمی کل رات سے

اس تغیّر کے لئے اُن کو دعا دیتا ہوں مَیں
مَوت تھی کل رات تک ہے زندگی کل رات سے

ہو رہا ہے مہرباں مجھ پر وہ رشکِ صد بہار
کھل رہی ہے پھر مرے دل کی کلی کل رات سے

اُن کا جلوہ خواب میں پُر کیف مجھ کو کر گیا
آنکھ میں آئی ہوئی ہے نیند سی کل رات سے

عالمِ وحشت تھا طاری ہر طرف کل رات تک
ہر در و دیوار میں ہے دل کشی کل رات سے
بن گیا ہے دل کا ہر ارمان اک بزمِ نشاط
نغمہ زن ہے عرش سازِ زندگی کل رات سے

۱۹۳۹

تبسّمِ دل نواز تیرا تکلّمِ دل نشیں سے بہتر
گمان تیری عنایتوں کا عنایتوں کے یقیں سے بہتر
نشاط پرور ہے چشمِ مے گوں تبسّمِ لب سے بھی زیادہ
کہ تلخیٔ مے ہے مے کشوں کو حلاوتِ انگبیں سے بہتر

دورِ عیش

فرمانِ مسرت ہوا پھر دہر پہ جاری — پھر راحت و عشرت ہوئے ہر روح میں ساری
پھر صحنِ گلستاں میں چلی بادِ بہاری — پھر بلبلِ شوریدہ کے گانے کے دن آئے

صد شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

صد شکر کہ ہیں کیف سے معمور فضائیں — صد شکر کہ پھر چھائی ہیں گلشن پہ گھٹائیں
صد شکر کہ پھر دور ہیں توبہ کی بلائیں — صد شکر کہ پینے کے پلانے کے دن آئے

صد شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

ہر شاخ پہ ہیں پھول تو غنچوں پہ تبسّم　　ہر ساز میں نغمے ہیں تو نغموں میں ترنّم

اللہ رے دریائے مسرّت کا تلاطم　　ہر موج کے پھر موج میں آنے کے دن آئے

صد شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

قدرت کا نیا ڈھنگ ہے، فطرت کا نیا طور　　کل اور تھا رنگ آج زمانے کا ہے رنگ اور

جس دور میں سب رند ہیں یہ دور ہے وہ دور　　پھر سرخوش و سرمست بنانے کے دن آئے

صد شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

کھلنے کو ہے الطاف و محبّت کا خزانہ　　ہے عرش کے لب پر بھی مسرّت کا ترانہ

آیا ہے امیدوں کے بر آنے کا زمانہ　　بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کے دن آئے

صد شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

۱۹۳۷

سوز و گداز

چون غم تو نتوان یافت مگر در دلِ شاد
ما به اُمیدِ غمت خاطرِ شادے طلبیم
(حافظ)

بیوہ کی فریاد

بے عطف و اضافت

کِسی کی یاد دل میں ہے کہ جِس سے جی نڈھال ہے

کہوں اگر تو کیا کہوں عجب طرح کا حال ہے

نہ وہ زمیں نہ وہ فلک نہ اب وہ کائنات ہے

وہ زندگی ہی اب نہیں نہ دن ہے وہ نہ رات ہے

وہ آرزو ہے کونسی جو آج پا بہ گل نہیں

ہے نام دِل کا دِل مگر جو سچ کہوں تو دِل نہیں

گھٹا اُٹھی تو ہے مگر پپیہا آج گائے کیا
تڑپ مری مٹائے کیا لگی مری بجھائے کیا

وُہ پریم سے بھرے بچن کہ جن سے کان آشنا
وہ مست آنکھ مدبھری کہ جس سے جان آشنا

وہ بات بات پر ہنسی وہ چھیڑ پیار پیار میں
قرار اک تڑپ میں وہ تڑپ وہ اک قرار میں

کبھی اِدھر سے تاکنا کبھی اُدھر سے دیکھنا
وہ میرے دل کے شوق کو مری نظر سے دیکھنا

غرض وہ دن کہ جب مرے چمن میں اک بہار تھی
غرض وہ دن کہ جب خوشی مرے لئے سنگار تھی

غرض وہ دن کہ نغمہ زن مسرّتوں کا ساز تھا

غرض وہ دن کہ حُسن جب مرا نظر نواز تھا

غرض وہ دِن کہ دل سے جب نشان غم کا دُور تھا

غرض وہ دن کہ آنکھ میں بھرا ہُوا سرور تھا

غرض وہ دن کہ مَیں بھی جب کسی کے دل کا ناز تھی

غرض وہ دن نیاز کے کہ جب مَیں بے نیاز تھی

غرض وہ دن خیال تھا کہ اب نہ جائیں گے کبھی

چلے گئے کچھ اس طرح کہ پھر نہ آئیں گے کبھی

غضب یہ ہے شباب میں مرا سُہاگ لُٹ گیا

سفر میں تھا جو ہمسفر اُسی کا ساتھ چھُوٹ گیا

یہ سچ ہے مجھ غریب کا کوئی رفیق اب نہیں

یہ سچ ہے غم نصیب کا کوئی شفیق اب نہیں

فغاں میں اب وہ جوش ہے کہ جس کی انتہا نہیں

جگر میں اب وہ درد ہے کہ جس کی کچھ دوا نہیں

خیال ہے خزاں میں بھی مجھے اسی بہار کا

غضب ہے چھوڑتا نہیں فریب انتظار کا

اجل کی ایک شکل ہے یہ درد اس بلا کا ہے

دوا کروں تو کیا کروں کہ وقت اب دعا کا ہے

مری طرح نہ زندگی کسی کی یوں عجیب ہو

نصیب موت ہو اگر تو زندگی نصیب ہو

۱۹۳۹

محبوب کا آخری خط

لو ہم تو چلے اسلامِ رخصت
اب لیجئے گا پیامِ رخصت

اک سوز میں دل پگھل رہا ہے
دامانِ خیال جل رہا ہے

اپنی بھی ہمیں خبر نہیں ہے
رونے پہ بھی آنکھ تر نہیں ہے

گو تلخیٔ غم رہی گوارا
اس نے بھی دیا نہ کچھ سہارا

دُنیا کا یہی چلن رہا ہے
راحت تو ہے کم، الم سوا ہے

قُدرت کے یہی ہیں کارخانے
تقدیر کے راز کون جانے

افشا ہُوا رازِ عشق سب پر
غم کو ملی فوقیت طرب پر

دیکھو جسے گھر میں مجھ سے ناراض
کوئی نہیں مرے دل کا نبّاض

چھپ چھپ کے جو ہو رہی ہیں باتیں
تقدیر کی ہیں یہ ساری گھاتیں

کیا وہم نے گُل کِھلا دِئے ہیں
اچھّے بھی بُرے بنا دئے ہیں

گو صاف نہ کچھ بھی کہہ سکوں گی
رُسوائیاں اب نہ سہہ سکوں گی

لازم ہے یہی کہ زہر پی لُوں
مر کر ہی بنامِ عشق جی لُوں

مرنے کی خبر جو پاؤ گے تُم
رو رو کے مجُھے بُلاؤ گے تُم

ظاہر میں تو بے وفا کہو گے
دل سے مرے مُعتقد رہو گے

لیکن یہ خیال بھی نہ کرنا
اس غم کا ملال بھی نہ کرنا

دُنیا ہے یہ اک سرائے فانی　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی

گُل شاخ پہ خوب لہلہا کے　　گرتے ہیں صبا کی چوٹ کھا کے

دستورِ فنا ہے سب پہ حاوی　　ہیں شاہ و گدا یہاں مساوی

زہّاد کا زُہدِ حیلہ جُو ہو　　یا رند کا شورِ وا لشّر بُو ہو

آواز ہو پھُول کی ہنسی کی　　گلشن میں چٹک ہو یا کلی کی

ہو فکرِ طرب کہ ذکرِ غم ہو　　افسانۂ بیش ہو کہ کم ہو

مفہوم ہر ایک کا فنا ہے　　ہر ایک کا منتہا فنا ہے

تُم سے تو نظر نہیں چُرائی　　ہمّت ہے خود اپنی آزمائی

احباب کے پاس کچھ نہ کہنا　　جو رنج ہو دل کا دل پہ سہنا

لینا مرے نام کی بلائیں　　گھر والے مگر نہ بھید پائیں

کھا کر بھی جگر پہ زخم تازہ — کچھ دُور سے دیکھنا جنازہ

ہونا نہ نڈھال غم نہ کرنا — مرنے کا مرے الم نہ کرنا

گو تم کو دیا غمِ جُدائی — معراج وفا کی مَیں نے پائی

تُم اشک نہ آنکھ سے بہانا — یوں ضبط کی انتہا دکھانا

ناکام مراد جا رہی ہوں — لیکن یہ مراد پا رہی ہوں

تُم مجھ کو شہیدِ غم کہو گے
تُم دادِ وفائے حُسن دو گے

۱۹۴۴

سُہاگن بیوہ

(شوہر کی دوسری شادی پر پہلی بیوی کے تاثرات)

عقدِ ثانی کے ترانے گا چکیں شہنائیاں

اب تو قسمت ہو چکیں میرے لئے رسوائیاں

اب وہ دولت لُٹ چکی ہَیں جس پہ اِتراتی رہی

وہ کسی کے ہو چکے ہَیں جن کو اپناتی رہی

عشرتِ فانی جسے کہتے ہیں فانی ہو چکی

نذرِ اندوہ جوانی نوجوانی ہو چکی

عشرتوں کے تار ماتم کی صدا دینے لگے

میرے ارماں مجھ کو مرنے کی دُعا دینے لگے

مانگ کا سیندور ہے یا سوزِ مجبوری کی آگ

مَیں وہ بیوہ ہوں کہ قائم ہے ابھی جس کا سُہاگ

اے مرے سرتاج اے میرے گلستاں کی بہار

اے محبّت کے امیں اے زندگی کے پاسدار

آپ کی برہم مزاجی کا مجھے شکوا نہیں

آپ کے دل کو دُکھاؤں مَیں نے یہ سیکھا نہیں

کیوں وفاؤں کو کروں آلودۂ فریاد میں

دوسری شادی پہ دیتی ہوں مبارکباد میں

آپ سے مانگوں میں کیوں ایثار و خدمت کے صلے

اپنی اُلفت کے صلے، اپنی محبّت کے صلے

خوب بہلائیں عروسِ نو کا جی بہلائیں آپ

کیف میں ڈوبے ہوئے دلکش ترانے گائیں آپ

تیز ہوں پھر آپ کے جذبات کی رنگینیاں

پھر کسی کے ساتھ ہوں گلزار میں گُل چینیاں

مجھ کو بھی ماں باپ سے روتی ہوئی لائے تھے آپ

گرم گرم اشکوں سے مُنہ دھوتی ہوئی لائے تھے آپ

مَیں نے بھی کچھ سوچ کر چھوڑا تھا گھر ماں باپ کا

مَیں نے بھی دل دے کے پایا تھا سہارا آپ کا

رتجگے وہ اور ارمانوں کے طوفاں یاد ہیں

مجھ کو پہلی رات کے وہ عہد و پیماں یاد ہیں

یاد ہے اک دوسرے کی غمگساری یاد ہے

وصل میں بھی دو دلوں کی بے قراری یاد ہے

اے مرے محبوب میری چشمِ گریاں کی قسم

دردِ دل کی حسرتوں کے جوشِ طوفاں کی قسم

کچھ کہو کیا آپ کو بھی وہ زمانہ یاد ہے

عشق کی رنگینیوں کا وہ فسانہ یاد ہے

آہ وہ راتیں کہاں اب وہ مُلاقاتیں کہاں

آہ وہ رُوٹھے ہوئے دل کی مداراتیں کہاں

آہ پھر ظالم محبّت مجُھ کو بہکانے لگی

پھر طبیعت شکوہ سنجی کی طرف جانے لگی

آپ میرے دیوتا میری جوانی کے سنگار

یہ مری تقدیر ہے جو پھر گئے لیل و نہار

فرض ہے مَیں آپ کی خاطر دُعا کرتی رہوں

خالقِ عالم کے در پر التجا کرتی رہوں

آپ کو حاصل دُلہن کی ناز برداری رہے

اُس کے پریتم آپ ہوں وہ آپ کی پیاری رہے

ہے یہی تقدیر اگر میری رہوں میں غم نصیب

آپ کی اُلفت کو استقلال کا ہو دم نصیب

آپ کی آنکھیں ہوں عشرت کے نظاروں کے لئے

آپ کا باغِ محبّت ہو بہاروں کے لئے

میرا حالِ زار ہے مجبوریاں مجبوریاں

ہے بیانِ غم مرا معذوریاں معذوریاں

فرض ہے اُلفت کا جو اس کو نباہوں گی ضرور

اک معافی اپنی تقصیروں کی چاہوں گی ضرور

آہ مجھ کو اپنی مجبوری پہ غم کھانے بھی دو

آئی تھی روتی ہوئی روتی ہوئی جانے بھی دو

۱۹۳۹

جوگن پھرے اُداس

تن پہ بھبوت گلے میں مالا

انگ انگ یوون متوالا لوگ کریں اُپہاس پیا بن جوگن پھرے اُداس

نرمل من ہے سُندر مکھڑا

ہائے سنائے اپنا دُکھڑا جا کر کس کے پاس پیا بن جوگن پھرے اُداس

من کا بھید چھپاتی جائے

آنسو پی کر گاتی جائے بجھے نہ من کی پیاس پیا بن جوگن پھرے اُداس

پھولوں کی بُو باس ہے اس میں

کہنے کو اُلہاس ہے اس میں جھوٹا ہے اُلہاس پیا بن جوگن پھرے اُداس

۱۹۴۳

مُتفرِّقات

بہر حالے کہ بُودم خوش سرودم
نقاب از رُوئے ہر معنی کشودم
(اقبال)

رازِ بقا

لوگ کِس دُھن میں ہیں غافل! دیکھ آنکھیں کھول کر
جا پرکھ اپنی طاقتِ پرواز بازو تول کر
دیکھ دُنیا میں بپا ہے ایک جنگِ ارتقاء
دیکھ آنکھیں کھول کر او وجہِ ننگِ ارتقاء
دیکھ دُنیا کہہ رہی ہے بر ملا ہر ایک سے
جِس کو جینا ہو وہ جینے کے لئے ہمّت کرے

گرمیٔ رفتار ہی سے زندگی میں جان ہے

آج کل ذوقِ عمل ہر ایک کا ایمان ہے

ایک سے اک بڑھ کے سرگرمی عیاں ہے دہر میں

نوجواں سے چُست پیرِ ناتواں ہے دہر میں

صنفِ نازک کی بھی اب دُنیا بدل جانے کو ہے

یہ زمانہ اک نرالی چال چل جانے کو ہے

اک تگ و دو ہے زمانے میں کہ طاقت چاہیئے

شور ہے ہر سمت عالم میں کہ ہمّت چاہیئے

اک تحرّک سا ہے سرگرمِ عمل اجسام میں

جان گویا پڑ رہی ہے آج کل اصنام میں

اوجِ عزّت پر ارادے مائلِ پرواز ہیں
طُور کے جلوے دلِ پُرشوق کے دم ساز ہیں

مستعد ہیں حوصلے ہمّت بڑھانے کے لئے
عالمِ بالا کو بھی نیچا دکھانے کے لئے

جو تمنّا ہے اُبھرنے کے لئے بے تاب ہے
دل نہیں پہلو میں گویا برق ہے سیماب ہے

تجھ کو بھی کچھ ہے یہ آگاہی کہ ہے کس حال میں
کس قفس میں بند ہے تو قید ہے کس جال میں

کچھ سکت رکھتا ہے تو زنجیرِ غفلت توڑ دے
او تغافل کیش اِس خوابِ گراں کو چھوڑ دے

یاس کی ظلمت میں جینا بھی کوئی جینا نہیں

جس کے سینے میں نہیں ہے طُور وہ سینا نہیں

وہ تجلّی ڈھونڈھ جس سے دل میں ہو تابندگی

جو عمل کا درس دے وہ زِندگی ہے زِندگی

اُٹھ کہ دُنیا منتظر ہے کام کی کچھ کام کر

خواہشِ آرام ہے تو قبر میں آرام کر

تُو بھی دُنیا کو دکھا دے اپنی شانِ زندگی

تُو بھی پیدا کر زمیں پر آسمانِ زندگی

منزلِ تاریک طے کر گرمئ رفتار سے

مانگ لے بیدار آنکھیں طالعِ بیدار سے

تیرے بازو میں سکت ہو حوصلہ کچھ دل میں ہو
اور کچھ غیرت کا عنصر تیرے آب و گل میں ہو

پھر تجھے حاصل ہو جینے کا مزا او بے خبر
پھر کہیں تجھ پر کھلے رازِ بقا او بے خبر

۱۹۳۳

نعرۂ مزدور

مری مشقّتِ پیہم رہینِ یاس نہیں

ارادہ جوشِ بغاوت کا بے اساس نہیں

سیاست اہلِ زمانہ کی مجھ کو راس نہیں

مرا سیاستِ اہلِ جہاں کو پاس نہیں

چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

مجھے اسیرِ ستمہائے روزگار کیا
مری بہار کو بیگانۂ بہار کیا
وقار مجھ سے لیا مجھ کو بے وقار کیا
مجھے سیاستِ اہلِ جہاں نے خوار کیا

چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

یہ شہریار کا عالم فریبِ حکمِ سجود
یہ سلطنت کے فرامینِ شیطنت آلود
یہ عزّ و جاہ کی دُنیا یہ مسکنِ مردود
سیاست اہلِ جہاں کی فریبِ نام و نمود

چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

مَیں ایک شیرِ نیستاں شغال سے بھی حقیر
فریبِ اہلِ زمانہ کے دام میں ہوں اسیر
مرے لہو سے ہیں پلتے وزیرِ بے تدبیر
سیاست اہلِ جہاں کی مرے لہو کا خمیر
چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

خرد کا شعبدہ صورت گرِ ہنر آرائیں
خرد کے در پہ مشقّت کی سجدہ ریز جبیں
خرد زمانے کی وحشت طرازیوں کی امیں
سیاست اہلِ جہاں کی خرد کا دامِ حسیں
چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

چل آحقیقتِ قلبِ تپاں بدل ڈالیں

چل آحسابِ دلِ دوستاں بدل ڈالیں

خموشئ غم و دردِ نہاں بدل ڈالیں

چل آسیاستِ اہلِ جہاں بدل ڈالیں

چل آسیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

جو گر رہی ہے عمارت سنبھل ہی جائے گی

مصیبتِ سرِ مزدور ٹل ہی جائے گی

یہ جبر و ظلم کی زنجیر گل ہی جائے گی

سیاستِ اہلِ جہاں کی بدل ہی جائے گی

چل آسیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

۱۹۴۱

امیروں کی دُنیا

کسی کی طبیعت میں پندارِ ہستی — کسی کو غرورِ جوانی کی مستی

کوئی مستِ میخانۂ خود پرستی — امیروں کی دُنیا تکبّر کی بستی

فریبوں کے سائے میں ڈیرا ہے اِن کا

گناہوں کے گھر میں بسیرا ہے اِن کا

کوئی اپنے زورِ حکومت پہ نازاں — کوئی مال و دولت کی کثرت پہ نازاں

کوئی اپنے ایواں کی رفعت پہ نازاں — کوئی حشمت و جاہ و ثروت پہ نازاں

وہ نشّہ چڑھا ہے کہ بھُولا خدا بھی

یہ سنتے نہیں بیکسوں کی دُعا بھی

جو نایاب شے ہو اسے ڈھونڈ لائیں　　جو مرغوبِ خاطر ہو وہ چیز کھائیں

جو گرمی کو چاہیں تو سردی بنائیں　　اڑائیں پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوائیں

زمانے میں چلتی اگر ہے تو اِن کی

یہاں دال گلتی اگر ہے تو اِن کی

ہے دشوار ان کو بلندی نہ پستی　　امیروں کی دنیا میں مہنگی بھی سستی

نہ دیکھی انہوں نے کبھی فاقہ مستی　　یہ ہیں بے نیازِ غمِ تنگ دستی

یہ مفلس کی مشکل کو کیا جانتے ہیں

یہ نادار کو خاک پہچانتے ہیں

گذرتی ہے شب جو ہوس رانیوں میں　　تو کٹتا ہے دن فتنہ سامانیوں میں

یہ ہیں مست اپنی تن آسانیوں میں　　زمانہ ہے اِن سے پریشانیوں میں

غریبوں کے حق میں بلا بننے والے

یتیموں کے حق میں قضا بننے والے

زمانہ ہو زرچ جس سے وہ چال کر دیں | جو ممکن ہو دنیا کو پامال کر دیں
اگر ہو سکے سب کو کنگال کر دیں | جو خوش حال ہوں ان کو بدحال کر دیں

غرض ان کے دل ہیں محبّت سے خالی

اخوّت سے خالی عنایت سے خالی

جو بولے کوئی تو زباں کاٹ ڈالیں | جو دیکھے کوئی اس کی آنکھیں نکالیں
نہیں ان سے ممکن کسی کو سنبھالیں | کوئی مر رہا ہو تو اس کو بچالیں

مگر شکر ہے عرش فضلِ خدا کا

وہ خلّاق حافظ ہے ہر بے نوا کا

۱۹۳۵

عرضِ حقیقت

مری فطرت میں گو موجود ہیں جذباتِ طوفانی

نرالا ہے جہاں سے گو مرا ذوقِ سخندانی

مری کوشش ہے گو مَیں نظم کو سلکِ گہر کردوں

مری خواہش ہے گو اشعار کو پاکیزہ تر کردوں

مجھے گو اک زمانے سے نرالی دُھن سمائی ہے

مگر حارج مرے رستے میں میری بے نوائی ہے

گرفتارِ غمِ ہستی اسیرِ قعرِ پستی ہوں

جو بس بس کر اُجڑ جائے مَیں وہ برباد بستی ہوں

دیا فطرت نے بہرہ جس قدر روشن خیالی کا

اُڑایا اس قدر حصّہ مری آسودہ حالی کا

نہ شکوہ ہے مقدّر کا نہ قسمت کی شکایت ہے

مجھے صبر و رضا کی راہ پر چلنے کی عادت ہے

جنونِ شعر گو اِک آئینہ ہے ہوشمندی کا

مگر اُلٹا ہے اس میں عکس میری سربلندی کا

اگر چاہوں تو ذرّے میں ضیا خورشید کی بھر دُوں

اگر چاہوں خزف کو آب میں رشکِ گہر کر دُوں

اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کر دکھاؤں میں

اگر چاہوں بگولا بن کے صحرا کو اڑاؤں میں

اگر کہنے پہ آجاؤں بقا کو لا فنا کہہ دوں

زمیں کو عرش کہہ دوں عرش کو تحت الثریٰ کہہ دوں

اگر ہر جھوٹ سچ کہنے پہ آجائے زباں میری

روانی میں بڑھے گنگا سے بھی طبعِ رواں میری

خوشامد کی ریاکاری سے لیکن دُور رہتا ہوں

میں ہوں مجبورِ فطرت اس لئے معذور رہتا ہوں

یُونہیں دردیہ مجھ کو جبہ سا ہونا نہیں آتا

مری خودداریوں کو مُفت کا رونا نہیں آتا

۱۹۳۳

در خراباتِ مُغاں نورِ خُدا می بینم

وِیں عجب بیں کہ چہ نُورے زکُجا می بینم

(حافِظ)

اے پیرِ خرابات

رِندوں کو ترے دم سے یہ حاصل ہیں کمالات
آیات سے ہرگز نہیں کم ان کے حکایات
جام ان کا وظیفہ ہے صُراحی ہے مناجات
اسرارِ جہاں کھولتی ہے ان کی ہر اک بات
منجملۂ اربابِ کرامت ہے تری ذات
اے پیرِ خرابات

جامِ مے گلگوں ہے تجلّی گہِ صد طُور
ظلماتِ جہالت کو یہ کر دیتا ہے کافُور
خاکِ درِ مے خانہ کا ہر ذرّہ ہے پُر نُور
ہر گوشہ یہاں روشنیٔ عقل سے معمُور
اُٹھتے ہیں یہاں آکے توہّم کے حجابات   اے پیرِ خرابات

خُردی و بزرگی کی یہاں جنگ نہیں ہے
پستی و بلندی کا کہیں زنگ نہیں ہے
ہر دل ہے کشادہ کوئی دل تنگ نہیں ہے
جھگڑوں کی بنا نسل نہیں رنگ نہیں ہے
رندوں نے ترے فیض سے سیکھی ہے مساوات   اے پیرِ خرابات

ممکن ہی نہیں یہ کہ کبھی تجھ سے ہوں ہم دور

رہتے ہیں ترے دم سے زمانے کے ستم دور

ہوتا ہے ترے قول سے ماحول کا غم دور

کرتی ہے تری بات وراثت کا الم دور

صادق ترا ہر قول ہے برحق تری ہر بات   اے پیرِ خرابات

کیوں رکھا ہے چہرے کو حقیقت کے چھپا کر

یہ چہرہ دکھا دے ہمیں پردوں کو ہٹا کر

اسرارِ جہاں کھول دے اک جام پلا کر

دُنیا ہے بڑے پیچ میں اس راز کو وا کر

یہ دارِ عمل ہے کہ ہے یہ دارِ مکافات   اے پیرِ خرابات

ممکن ہی نہیں تجھ سے کریں رند کنارا
پینے کا سہارا ہے تو جینے کا سہارا
تو ہے تو ہر اک تلخیٔ دوراں ہے گوارا
واللہ ترے لطف کا افسانہ سا اشارا
ان کے لئے ہے مایۂ صد فخر و مباہات اے پیرِ خرابات

دُنیا کے ڈرانے سے کبھی ہم نہ ڈریں گے
اُمید کا دامن تری بخشش سے بھریں گے
سجدہ ترے در پر ہی کریں گے جو کریں گے
جیتے ہیں اِسی در پہ اسی در پہ مریں گے
ہر حال میں سمجھیں گے تجھے قبلۂ حاجات اے پیرِ خرابات

۱۹۵۰

رُباعیات

ساقی نے کیا دورِ مئے ناب شروع

بھاگیں مری محفل سے سجُود اور رُکوع

گُل کردو ذرا شمعِ سرِ مے خانہ

ہوتا ہے مرے جام سے خورشید طلوع

رِندوں سے یہ نفرت یہ کدورت بے کار

آلودۂ تقدیس نہیں یہ زنہار

زُہرہ سے کہو آئے زمیں پر ناچے

انساں ہیں فرشتے نہیں ہرگز میخوار

ساقی! غمِ دُنیا سے حذر جام پلا
مرنے کا نہیں مجھ کو خطر جام پلا
جینے کی دُعائیں جو بزرگوں سے ملیں
لے وہ بھی تری نذر، مگر جام پلا

حد کر نہ مقرر مری بے ہوشی کی
کچھ شرم بھی رکھ اپنی خطا پوشی کی
پایانِ کرم ایک فقط ایک ہی جام
توہین نہ کر میری بلا نوشی کی

بچھڑے ہوئے احباب جو مل جاتے ہیں
چاکِ دلِ افسردہ بھی سِل جاتے ہیں
پی کر جو نکل جاتا ہوں مَیں سوئے چمن
غنچے مری تعظیم میں کِھل جاتے ہیں

بادہ ہے کہ ہے نسخۂ تسخیرِ قلوب
بوتل ہے بغل میں کہ ہے وصلِ محبوب
یوں ملتے ہیں لب جامِ مئے احمر سے
خورشید و شفق جیسے بہ ہنگامِ غروب

اک جام مجھے بہرِ خدا اے ساقی
پردے سے ذرا سامنے آ اے ساقی
مطرب جو نہیں چھیڑ تو ہی اک نغمہ
ہے گوش بر آواز فضا اے ساقی

مجھ رِند کو بخشی جو شراب اے ساقی
دُنیا میں نہیں ترا جواب اے ساقی
ہر قطرہ مرے حق میں کرم کی بارش
اب جام کا تُو کر لے حساب اے ساقی

ساقی نے کہا غیرتِ ناہید ہوں مَیں
مے بول اُٹھی جلوۂ اُمید ہوں مَیں
ساغر سے چھلک کر جو زمیں تک پہنچی
ہر ذرّہ پُکار اُٹھا کہ خورشید ہوں مَیں

مغرب سے اُمنڈتے ہوئے بادل آئے
بھیگی ہوئی رُت اور سُہانے سائے
ساقی، لبِ جُو، مطربِ نوخیز، شراب
ہے کوئی جو واعظ کو بُلا کر لائے

رندی ہے تو پھر کیفِ غمِ ہستی کیوں
یہ مخمصۂ بیش و کمِ ہستی کیوں
اک لے پہ تو اس ساز کو بج لینے دے
یہ واہمۂ زیر و بمِ ہستی کیوں

ساقی یہ توقّف یہ تساہُل کب تک
خاموشیٔ ہنگامۂ قُلقُل کب تک
باتوں کے نہیں ہم ہیں عمل کے قائل
یہ سہل پسندی یہ توکُّل کب تک

رِندوں کے لئے منزلِ راحت ہے یہی

میخانۂ پُر کیفِ مُسرّت ہے یہی

پی کر تو ذرا سیرِ جہاں کر اے شیخ

تُو ڈھونڈتا ہے جس کو وہ جنّت ہے یہی

ہر ظرف کو اندازے سے تول اے ساقی

یہ خُبث بھرے بول نہ بول اے ساقی

مے اور تری تلخ نوائی توبہ

یہ زہر نہ اس شہد میں گھول اے ساقی

فردوس کے چشموں کی روانی پہ نہ جا
اے شیخ تو جنّت کی کہانی پہ نہ جا
اس وہم کو چھوڑ اپنے بڑھاپے ہی کو دیکھ
حُورانِ بہشتی کی جوانی پہ نہ جا

تُو آتشِ دوزخ کا سزاوار، کہ مَیں
تُو سب سے بڑا مُلحد و عیّار، کہ مَیں
اللہ کو بھی بنا دیا خُود فروش
اے شیخ بتا تُو ہے گنہگار، کہ مَیں

۱۹۴۰-۴۲

دَور چلے

غم کا اب فکر ہی کیا دَور پہ اب دَور چلے　　ساقیا اَور چلے اَور چلے اَور چلے

مے کشو پینے پلانے میں توقّف کیسا　　دَور چلنا ہی جو لازم ہے تو فی الفور چلے

چھوٹتا ہی نہیں زاہد مے کوثر کا خیال　　اپنا جادُو جو چلے اس پہ تو کس طَور چلے

دے کبھی جام کبھی اوک ہی بھر دے ساقی　　دَور ساون کے مہینے میں بہ ہر طَور چلے

اُن سے کہہ دو کہ نہ اب رحم کریں عرش پہ وُہ

بند پھر کیوں ہو اگر سلسلۂ جَور چلے

۱۹۴۲

جھوم کے پی

ساغر کا منہ چوم کے پی جھوم کے پی مے جھوم کے پی

رقص میں آئے میخانہ بےتابی سے گھوم کے پی

دورِ جہاں کا ایسا ہے مستی میں آ جھوم کے پی

نشّہ کیسا آداب کہاں ساقی کا منہ چوم کے پی

جام اٹھا اور وجد میں آ بادل آئے جھوم کے پی

رُت ہے آج بہکنے کی واعظ کا منہ چوم کے پی

عرش سے کل جو اتری ہے

آج تو اس کو جھوم کے پی

۱۹۴۲

ہو جوانی میں عار پینے سے — موت اچھی ہے ایسے جینے سے

مے کشو احترامِ ساقی میں — جام و مینا دھرو قرینے سے

واہ رے ضبط پھنک گیا دل بھی — آہ نکلی مگر نہ سینے سے

کوئی موسم ہو کوئی ساقی ہو — ہم کو مطلب فقط ہے پینے سے

چوٹ کھائے جگر تو یہ جانو — موج ٹکرائی ہے سفینے سے

آبگینے میں ڈھال اے ساقی — اپنی آنکھوں کے آبگینے سے

میری توبہ نے ٹوٹ کر یہ کہا — زندگانی بڑھے گی پینے سے

کیوں نہ ہو شوقِ جام ساون میں — مے کو نسبت ہے اس مہینے سے

کیا پیئے گا جو بے پیئے اے عرش
تر ہے تیری جبیں پسینے سے

۱۹۴۰

مطرب کجاست تا ہمہ محصولِ زہد و علم
در کارِ بانگِ بربط و آوازِ نے کنم

(حافظ)

کِسان کا گیت

چل میرے گورے چل، چل، چل

رازق ہے وہ خالق سب کا
میرا بھی اس سے ہے ساجھا

دیتے ہیں دُنیا کو روزی
اس کی زمیں اور میرا ہل

چل میرے گورے چل، چل، چل

ساہوکار اور گھوڑے ہاتھی
تُو میرا ہیں تیرا ساتھی

محنت سے ہم کترائیں کیوں
محنت ہے محنت کا پھل

چل میرے گورے چل، چل، چل

دُنیا کی ہر دولت ہم سے
کھانے کی ہر نعمت ہم سے

دیتے ہیں جسموں کو طاقت   تیری شکتی میرا بل

چل میرے گورے چل، چل، چل

محنت کو آفت نہ سمجھ تُو   خدمت کو زحمت نہ سمجھ تُو

مان ہمارے دُکھ سہنے کا   آج نہیں تو ہو گا کل

چل میرے گورے چل، چل، چل

۱۹۳۹

چھوڑ بھی دے او کھیون ہار

کھینے بھی دے مجھ کو نیّا   اپنا ہوں مَیں آپ کھویّا

لاکھ ڈرائیں میرے من کو   یہ ساگر اور یہ منجدھار

چھوڑ بھی دے او کھیون ہار

تند تھپیڑے سہہ لینے دے — اپنی موج میں بہہ لینے دے

لے جانے دے اپنی کشتی — اِن طوفانوں کے اُس پار

چھوڑ بھی دے او کھیون ہار

طوفانوں نے ہاتھ بڑھائے — جیون نیّا ڈوبی جائے

مجھ پہ ہی چلنے کی خاطر — ہر اک موج بنی تلوار

چھوڑ بھی دے او کھیون ہار

اپنی نیّا اپنی دھارا — دُور ہو یا نزدیک کنارا

یہ سنگرام مجھے لڑنے دے — جیت ہو اس میں یا ہو ہار

چھوڑ بھی دے او کھیون ہار

۱۹۴۲

میرے من کی آشا جاگ

من کا منور تھ مِل جائے گا　　من کا کنول بھی کِھل جائے گا

من کی منڈیر پہ بول رہا ہے　　کلپن رُوپی کاگ

میرے من کی آشا جاگ

نِدرا کا سُکھ موت کا سُکھ ہے　　نِدرا میں تو دُکھ ہی دُکھ ہے

رَین نہیں اب ہوا سویرا　　اُٹھ نِدرا کو تیاگ

میرے من کی آشا جاگ

قِسمت کے ہیں بیٹے بھی جاگے　　نِدرا کے بیٹے بھی جاگے

تُو جاگے تو پھر کیا کہنا　　جاگ اُٹھیں گے بھاگ

میرے من کی آشا جاگ

من میں ایسی کے لبس جائے   ناگن بن کر جو ڈس جائے

مے کا زہر چڑھے نس نس کو   چھیڑ دے دیپک راگ

میرے من کی آشا جاگ

۱۹۴۲

اندھا نیائے

اندھا جگ کا نیائے رے منوا اندھا جگ کا نیائے

سونے چاندی کی پوجا میں اندھے ہیں دھنوان

اِن کی نگری میں ہوتا ہے نِردھن کا اپمان

ہم سے سہا نہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیائے

دھرم کے پلّے ہار ہے نِسدِن پاپ کے پلّے جیت

گُن وانوں کو کوئی نہ پُوچھے پُیش مُورکھ کا میت

ہم سے سہا نہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیائے

سُکھ کے کان نہیں سنتے ہیں دُکھ کا کُرن وِلاپ

مرنے سے بھی کچھ بڑھ کر ہے جیون کا سنتاپ

ہم سے سہا نہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیائے

۱۹۴۴

نِردھن کا دُکھ جانے کون

لوبھی ہیں سارے سنساری ۔ نِردھنتا کا دُکھ ہے بھاری

اس دُکھ کو پہچانے کون ۔ نِردھن کا دُکھ جانے کون

رَین ہے تو ہے دن کا اُجالا ۔ نِردھن ہے تو ہے دھن والا

لیکن اس کو مانے کون ۔ نِردھن کا دُکھ جانے کون

سُکھ کے راگ دھنی گاتے ہیں　　　دھن کے بدلے سُکھ پاتے ہیں

دُکھ کی کتھا بجھانے کون　　　نِردھن کا دُکھ جانے کون

۱۹۴۴

من کی بات

پگڈنڈی کی بُھول بھلیّاں بھیانک کالی رات

بادل گرجے بجلی کڑکے اور بھری برسات

ایسے میں اپنے ساجن کو ڈھونڈت ڈھونڈت ہاری

من کی بات سناؤں کس کو کون سُنے گا من کی بات

دیس میں رہ کر اب کیا لُوں گی پیا گئے پر دیس

تن پر راکھ ہے ہاتھ میں مالا جوگن کا ہے بھیس

پریتم میرا سب سے نیارا مَیں پریتم سے نیاری

من کی بات ہے مجھ سے نیاری تن ملے کہوں من کی بات

ساگر سے ملنے پر ندّی پاتی ہے بسرام

ساجن مجھ کو آپ ملے گا کھوج ہے میرا کام

اپنے آپ میں آؤں گی میں کھو کر سدھ بدھ ساری

ساجن من کی بات سُنے گا اُس سے کہوں گی من کی بات

۱۹۴۱

ہمارا دیش

دیش ہمارا سب سے نیارا   سب سے پیارا دیش ہمارا

پُورب پچھّم دکھّن اُتّر
اُونچے پربت گہرے ساگر
شوبھا سے بھرپُور یہ مندر
شوبھا اس کے باہر اندر

اصغر، اکبر، شیام، منوہر مِل کر گائیں گیت یہ پیارا
دیش ہمارا سب سے نیارا سب سے پیارا دیش ہمارا

بن برکھا نہروں سے جل تھل
چوکھی کھیتی سبزی اور پھل
ہریالے ہریالے جنگل
جنگل جن میں ہر دم منگل

نجمہ، زہرہ، چیپلا، چنچل — مل کر گائیں گیت یہ پیارا

دیش ہمارا سب سے نیارا — سب سے پیارا دیش ہمارا

اس کی خاطر واریں تن من

اس پہ نچھاور سب مال اور دھن

اس کے نام کو کر دیں روشن

خوب پھلے پھُولے یہ گلشن

رجنی، راشد، سلمیٰ، موہن — مل کر گائیں یہ گیت پیارا

دیش ہمارا سب سے نیارا — سب سے پیارا دیش ہمارا

۱۹۴۳

پَن گھَٹ

چل ری سکھی پنگھٹ پر جائیں گاگریا بھر لائیں

بھور بھئی اب پنچھی جاگے آشا کی دُھن گائیں

چل ری سکھی پنگھٹ پر جائیں گاگریا بھر لائیں

نیند کے ماتے جاگ اُٹھے ندیا نے لی انگڑائی

نین اُگھارے پریم دوس نے اوشا بھی مُسکائی

شوبھا کا یہ نرمل درپن دیکھیں اور مُسکائیں

چل ری سکھی پنگھٹ پر جائیں گاگریا بھر لائیں

کھائے رہی ہے شیت پَوَن سے ہر ڈالی ہچکولے

جائے رہی ہیں سکھیاں سب اِٹھلاتی ہَولے ہَولے

آؤ چلیں ہم بھی سنگ اُن کے ٹھمک ٹھمک بل کھائیں

چل ری سکھی پنگھٹ پر جائیں گاگریا بھر لائیں

پیڑ کے نیچے گاتا ہے جو روز رسیلی تانیں

آؤ اُس کے من کو جیتیں اُس سے ہار نہ مانیں

شرمانے کی بات نہیں کچھ مفت میں کیوں شرمائیں

چل ری سکھی پنگھٹ پر جائیں گاگریا بھر لائیں

۱۹۴۲

دیپک تلے اندھیرا

دیپک جگ میں کرے اُجالا دیپک تلے اندھیرا

ہر ساتھی ہے سُکھ کا ساتھی کوئی نہیں ہے دُکھ کا ساتھی

مَیں کہتا ہوں میں ہُوں سب کا کوئی نہیں ہے میرا

دیپک جگ میں کرے اُجالا دیپک تلے اندھیرا

مرگ ترشنا ہے منزل میری جیون ہے اک رات اندھیری
دیکھ نہیں سکتیں یہ آنکھیں آشا رُوپ سویرا

دیپک جگ میں ـ ـ ـ ـ ـ

چنتا میں گھُل گھُل کر مرنا اپنے ہی سائے سے ڈرنا
من کی بستی لُوٹی مَیں نے مَیں ہوں آپ لُٹیرا

دیپک جگ میں ـ ـ ـ ـ ـ

چنتا، دُبدھا، شنکا، کلپن اس پہ پکاروں ساجن ساجن
ساجن من سے دُور براجے من ساجن کا ڈیرا

دیپک جگ میں ـ ـ ـ ـ ـ

۱۹۴۲

جیون کا درپن دیکھ لیا

دُکھ سُکھ کی تصویریں اِس میں

خوابوں کی تعبیریں اِس میں

تدبیریں تقدیریں اِس میں
اُمید بھرا من دیکھ لیا

جیون کا درپن دیکھ لیا

کچھ آقا بھی کچھ بندے بھی

کچھ مکر و ریا کے پھندے بھی

لالچ کے گورکھ دھندے بھی
دُنیا کا ہر فن دیکھ لیا

جیون کا درپن دیکھ لیا

کانٹے اِس میں ہیں گُل اِس میں
صیّاد اِس میں بُلبُل اِس میں
زہر اس میں شراب و مُل اس میں
یہ نیارا گُلشن دیکھ لیا
جیون کا درپن دیکھ لیا

کچھ اس سے عیاں خوش حالی بھی
کچھ اس میں نہاں پامالی بھی
بھرپور یہ بھی ہے اور خالی بھی
آشا کا دامن دیکھ لیا
جیون کا درپن دیکھ لیا

۱۹۴۲